برصغیر میں
مسلمان معاشرہ کا المیہ

ڈاکٹر مبارک علی

فون: 7249218-7237430
E-mail:FictionHouse2004@hotmail.com

نام کتاب : برصغیر میں مسلمان معاشرہ کا المیہ
مصنف : ڈاکٹر مبارک علی
پبلشرز : فکشن ہاؤس
18-مزنگ روڈ، لاہور
فون:7249218-7237430
اہتمام : ظہور احمد خاں
کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز : حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور
سرورق : عباس
پہلا ایڈیشن : 1987ء
دوسرا ایڈیشن : 1990ء
تیسرا ایڈیشن : 1997ء
چوتھا ایڈیشن : 2000ء
پانچواں ایڈیشن : 2002ء
چھٹا ایڈیشن : 2005ء
قیمت : -/90روپے

فہرست

تعارف

(نئے ایڈیشن کے لئے)

ایشیا اور افریقہ کے جن جن ملکوں میں اسلام پھیلا. اس کو یا تو فاتحوں نے اپنی فتوحات کے ذریعہ پھیلایا۔ یا پھر تاجر اور مبلغوں نے اپنی سرگرمیوں سے لوگوں کو اس کی طرف راغب کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو اسلام فاتحین کے ذریعہ پھیلا اس میں سیاسی عوامل کو زیادہ دخل تھا اور جو تاجروں اور مبلغوں نے پھیلایا اس میں سماجی اثرات نے کام کیا۔ مشرق وسطی کے بہت سے ملکوں میں اسلام کو متعارف کرانے والے فاتحین ہی تھے۔ انہوں نے جیسے جیسے ان ممالک کو فتح کیا۔ وہاں ان کے ساتھ ایک بڑی تعداد مسلمانوں کی بھی آباد ہوتی رہی اور جب ان کے طبقہ امراء نے اسلام قبول کیا تو ان ملکوں کے معاشرے اسلامی ہو گئے۔

اسلام جن جن ملکوں میں پھیلا وہاں دو قسم کے اثرات ہوئے :اگر ان ملکوں کے امراء اور زمیندار طبقوں نے اسلام قبول کر لیا تو اس کے نتیجہ میں اسلام تیزی سے پھیلا اور اس نے مقامی ثقافتی اثرات کو اپنے اندر ضم کر لیا اور اس کو اسلامی معاشرہ کا ایک حصہ بنا لیا۔ جیسے ایران اور مشرقی افریقہ کے ملکوں میں ہوا۔

لیکن اگر طبقہ امراء اور جاگیردار مسلمان نہیں ہوئے تو اس صورت میں اسلام نے مقامی سماجی اثرات کو زیادہ قبول نہیں کیا اور فاتحین نے اپنی سماجی خصوصیات کو برقرار رکھا۔ اس کی مثال برصغیر ہندوستان کی ہے۔ یہاں پر چونکہ مقامی مراعات یافتہ اور طبقہ اعلیٰ کے افراد نے اسلام قبول نہیں کیا۔ اس وجہ سے مسلمان فاتحین کی جماعت نے سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ سماجی و ثقافتی علیحدگی کو برقرار رکھا. چونکہ ہندوستان میں مسلمان ہونے والے اکثر

طبقوں کا تعلق نچلی ذات کے لوگوں سے تھا. اس لئے ان کے ثقافتی اثرات کو ختم نہیں کیا گیا بلکہ حالات نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنا سماجی درجہ بلند کرنے کی غرض سے ایران و عربی ثقافت کو اختیار کریں۔

برصغیر ہندوستان میں اسلام جن جن علاقوں میں آیا وہاں اس کے اثرات مختلف ہوئے۔ مثلاً پنجاب میں فاتحین کے ساتھ بڑی تعداد میں آباد کار بھی آئے۔ جن کی وجہ سے مقامی طبقہ اعلیٰ مسلمان ہو گئے۔ اس لئے یہاں پر ان مقامی ذاتوں اور قبیلوں نے اپنی شناخت کو قائم رکھا اور اس پر فخر کیا۔ سندھ میں بھی لوگوں کی اکثریت مسلمان ہو گئی اور وہاں بھی بڑی تعداد میں باہر سے مسلمان آکر آباد ہوئے جن کی وجہ سے سندھی معاشرہ اسلامی رنگ میں رنگ گیا۔

مگر شمالی ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں رہے اور یہاں کی اکثریت مسلمان نہیں ہوئی اور نہ ہی ان کے حکمراں طبقوں اور برہمنوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کی وجہ سے مسلمان فاتحین نے نسلی اور سماجی و ثقافتی برتری کو قائم رکھا اور اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ ان میں مقامی اثرات نہیں آئیں۔ اس لئے اصلاح مذہب کی تمام تحریکیں شمالی ہندوستان سے اٹھیں اور یہ دوسرے علاقوں میں بھی غیر اسلامی اثرات کے خلاف جدوجہد کرتی رہیں۔ اگرچہ ہندوؤں کی نچلی ذاتیں جو مسلمان ہو گئیں تھیں۔ انہوں نے ہندوؤں کی بہت سے رسومات اور عقائد کو برقرار رکھا۔ مگر یہ ثقافتی ملاپ صرف ان کی حد تک محدود رہا اور مسلمان حکمراں طبقوں نے اپنی غیر ملکی شناخت اور اسلامی ثقافت کی علامات کو برقرار رکھا۔

جب مغلوں کے آخری دور میں سیاسی طاقت کا زوال ہوا تو اس کے ساتھ ہی سماجی و ثقافتی علامتیں بھی جو ان کے علیحدہ تشخص کو برقرار رکھے ہوئے تھیں وہ ختم ہونا شروع ہوئیں اور ایک ہندوستانی ثقافت کی تشکیل کا عمل شروع ہوا۔ جس کے خلاف وقتاً فوقتاً تحریکیں شروع ہوتی رہیں۔ انہیں میں ایک تحریک سید احمد شہید کی جہاد تحریک یا طریقہ محمدی تھی۔ جو اسلامی شعار کا احیاء چاہتے تھے اور اسے ہندووانہ رسومات

سے پاک کرنا چاہتے تھے۔

اس تحریک کے خاتمہ اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد مسلمان اونچی کلاس کے لوگوں میں پان اسلام ازم کی تحریک بڑی مقبول ہوئی اور ترکی کی حمایت اور خلافت کے ادارے کے تحفظ کے لئے انہوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ مگر خلافت کے خاتمہ (۱۹۲۴ء) کے ساتھ ہی اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

اس کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں میں ہندوؤں کی مخالفت میں مسلم قوم پرستی کے جذبات ابھرے۔ اس قوم پرستی کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ ایک ردعمل کے طور پر ابھری اور اس کی بنیاد ہندو دشمنی پر تھی۔ اس لئے اس نے مسلمان عوام کے جذبات کو ابھارا اور انہیں متحد کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ پاکستان کی بنیاد اسی مسلم قوم پرستی پر پڑی۔

اس لئے پاکستان بننے کے فوراً بعد ہمارے حکمراں طبقوں نے یہ فرض کر لیا کہ پاکستانی قوم کی تشکیل ہو چکی ہے اور مختلف صوبوں کے لوگوں نے اپنی زبان، نسل اور ثقافت کو قومی یک جہتی میں ضم کر دیا ہے۔ چنانچہ ابتدا ہی سے صوبائی تعصب کو برا بھلا کہا گیا اور جس نے بھی اپنی صوبائی شناخت کی بات کی اسے ملک دشمن گردانا گیا۔ یہ قوم پرستی اوپر سے لوگوں پر زبردستی مسلط کی گئی اور اس کی کمزوریوں کو چھپانے کی غرض سے جارحانہ غیر ملکی پالیسی کو اختیار کیا گیا تاکہ ہمسایہ ملک کے حملے کے خطرے کے پیش نظر لوگوں کو اس سے وابستہ رکھا جائے۔

لیکن وہ تمام کوششیں کہ جن سے صوبائی شناخت اور ثقافت کو دبا کر رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ ملک کے سیاسی عمل اور معاشی ناہمواری کے سبب ناکام ہو گئیں اور نسلی، لسانی اور مذہبی بنیادوں پر گروہ بندیاں بڑھتی گئیں۔ یہاں تک کہ نظریہ پاکستان کے تحفظ کے لئے قانون بنانے کی ضرورت پڑ گئی۔

اگر ہمیں اپنی غلطیوں کو سمجھ کر ان کا مداوا کرنا ہے اور انہیں درست کرنا ہے تو اس لئے ہمیں اپنی تاریخ کا مطالعہ کر کے اس سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ اسی سلسلہ میں ایک قدم ہے۔

مبارک علی

تاثرات

ہمارے معاشرے میں کتنے لوگ ہیں جنہیں تاریخی شعور ہے اور جو اس شعور کے زیر اثر اپنی زندگی، اپنے عمل اور اپنے کردار کی تشکیل کرتے ہیں، کتنے ہیں جنہیں اس بات کا احساس ہے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کا اثر تاریخ کے عمل پر ہو رہا ہے اور ان کے اعمال تاریخ کی تشکیل کر رہے ہیں۔ واقعات کے پیچ در پیچ دھارے میں ان کی توانائی، قوت اور فکر کا بھی دخل ہے۔ وہ معاشرے کے عروج و زوال میں برابر کا حصہ لے رہے ہیں۔ جب کوئی معاشرہ اجتماعی طور پر کوئی عمل کرتا ہے تو اس کا اثر نہ صرف زمانہ حال پر ہوتا ہے بلکہ یہ آنے والے زمانہ اور واقعات کے دھارے کو بھی متاثر کرتا ہے۔

تاریخ افراد کے کردار، ان کے اعمال، ان کی نیکیوں، برائیوں اور خوبیوں و بداعمالیوں پر نظر رکھتی ہے اور انہیں محفوظ کر لیتی ہے۔ وہ افراد جو ان جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں وہ معاشرہ کی سزا سے تو بچ سکتے ہیں مگر تاریخ کی سزا انہیں مل کر رہتی ہے۔

تاریخ میں معاشرہ کی اجتماعی ذہنیت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ اجتماعی ذہنیت سماجی و سیاسی اور معاشی قوتوں کے ہاتھوں تشکیل پاتی ہے۔ اس ذہنیت کو اگر فکری و عقلی دباؤ کے تحت وقت کے ساتھ بدلا نہیں جائے تو یہ ایک جگہ منجمد ہو جاتی ہے۔ برصغیر میں مسلمان معاشرہ کے ساتھ یہی ہوا کہ انہوں نے اپنی اجتماعی ذہنیت کو وقت کے ساتھ نہیں بدلا اور تاریخی واقعات و حادثات سے کچھ نہیں سیکھا۔ اسی لئے وہ یکے بعد دیگرے غلطیوں کے گرداب میں پھنستے چلے گئے اور آج تک اسی گرداب میں محو گردش ہیں۔

معاشرہ میں اگر تبدیلی کی جدوجہد انفرادی طور پر کی جائے تو اس کے اثرات بہت محدود رہتے ہیں اور ان انفرادی کوششوں سے انقلابی تبدیلی نہیں آتی۔ مثلاً امام

ابو حنیفہ ؒ اور امام حنبل نے عباسی مطلق العنانیت کے خلاف انفرادی جدوجہد کی جو اس مطلق العنانیت کو ختم نہیں کر سکی۔ جب تک مزاحمت کا دائرہ انفرادیت سے نکل کر وسیع نہیں ہو گا۔ اس وقت تک معاشرہ میں اجتماعی طور پر تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ جو افراد اکیلے جدوجہد کرتے ہیں وہ شہید کا درجہ تو حاصل کر لیتے ہیں مگر ان کی قربانی کوئی مثبت اثرات پیدا نہیں کرتی۔

جب قومیں انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی ہیں تو اہل دانش و فکر اس کے زوال کے اسباب اور وجوہات ڈھونڈنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہی کچھ اس وقت ہمارے معاشرے کے ساتھ ہے۔ یہاں سیاسی و ثقافتی اور اخلاقی روایات پژمردہ ہو کر مرجھا گئی ہیں اور معاشرے سے زندگی کے آثار ایک ایک کر کے ختم ہو رہے ہیں۔ تاریخ کے ایک طویل سفر کے بعد ہم اس منزل تک کیسے پہنچے؟ اور کیا اس تنگ نائے اور اندھیرے سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے یا نہیں؟ ان سوالات کا جواب ہمیں تاریخ سے مل سکتا ہے اور صحیح تاریخی شعور ہماری ماضی کی غلطیوں کی نشان دہی کر سکتا ہے اور یہی وہ راستہ ہے جو ہمارے مستقبل کو روشن بنا سکتا ہے۔

یہ برصغیر میں مسلمان معاشرہ کا ایک مختصر جائزہ ہے. جس میں ان حالات و وجوہات کا جائزہ لیا ہے کہ جس نے مسلمان معاشرہ کی ایک اجتماعی ذہنیت کو تشکیل کیا کہ جس کے تحت اس نے ہمیشہ اپنی مذہبی و سیاسی اور ثقافتی وفاداریوں کے مرکز کو ہندوستان سے باہر رکھا۔

تاریخی مفروضے

عام طور سے ہندوستان کی تاریخ میں عہد وسطی کو مسلمانوں کا دور حکومت کہا جاتا ہے۔ "مسلمان دور حکومت" کی یہ اصطلاح انگریزی عہد کی پیداوار ہے۔ اس کا مقصد فرقہ وارانہ اختلافات کو بڑھا کر ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت پیدا کرنا تھا۔ اور ہندوؤں میں یہ احساس پیدا کرنا تھا کہ وہ ایک طویل عرصہ تک مسلمانوں کے غلام رہے ہیں. اور انگریزوں نے آکر انہیں اس غلامی سے نجات دلائی ہے۔ تاکہ وہ مسلمانوں کے دور حکومت کو اپنے لئے باعث ذلت سمجھتے ہوئے انگریزی اقتدار کو نعمت سمجھ کر تسلیم کرلیں اور ان کے ساتھ مفاہمت کریں۔

اس اصطلاح کے ذریعہ قرون وسطی کے پورے عہد کو غیر ملکی حکمرانوں کا زمانہ کہا گیا تاکہ اس دلیل سے اہل برطانیہ. جو خود بھی غیر ملکی تھے. ان کی حکومت کا بھی جواز پیدا ہو جائے۔ اور یہ ثابت کیا جائے کہ اہل ہندوستان میں حکومت کرنے کی اہلیت و قابلیت بالکل نہیں ہے۔ اس لئے یہ ہمیشہ غیر ملکی اقتدار کے سایہ تلے رہے ہیں۔

تیسرے اس دور کو دور وحشت و بربریت اور ظالمانہ دکھایا گیا ہے اور اس کے مقابلہ میں برطانوی راج روشن خیال اور سیکولر بن کر ابھرتا ہے۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ برطانوی دور کا تعلق ہندو دور حکومت اور مسلمان دور حکومت کی طرح کسی مذہب سے نہیں تھا. بلکہ یہ ایک سیکولر دور تھا. جس میں ہندو اور مسلمان دونوں کو مکمل طور پر مذہبی آزادی تھی۔

بعد میں آنے والے ہندوستان مورخوں نے بھی ہندو اور مسلمان دور حکومت کی اصطلاحوں کو چیلنج نہیں کیا اور اس تقسیم کو قبول کر کے وہ اس فریم ورک یا دائرہ میں تاریخیں

لکھتے رہے اور اس لئے یہ تاریخیں فرقہ وارانہ تعصبات اور نفرتوں کو پیدا کرتی رہیں. اور تاریخ کو مذہب کے زیر اثر لکھ کر تاریخی واقعات کو مسخ کیا جاتا رہا۔ موجودہ دور میں چند روشن خیال مورخوں نے تاریخ کی اس تقسیم کو چیلنج کیا ہے اور دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ تاریخ میں ادوار کی یہ تقسیم اور یہ اصطلاحیں نہ صرف غلط بلکہ گمراہ کن ہیں۔ (۱)

— ۱ —

اس پورے دور کو جسے "اسلامی عہد" کہا جاتا ہے یعنی عربوں کی فتح سندھ سے مغل بادشاہت کے زوال تک (۷۱۲ـ۱۸۵۸) اس عہد کو ہم عصر مورخین نے کہیں بھی اسلامی یا مسلمانوں کا نہیں لکھا. بلکہ اسے حکمران خاندانوں کے نام سے یاد کیا ہے جیسے عربوں کی حکومت. یا خلجی ، تغلق. سید. لودی اور تیموری (عہد مغلیہ بھی بعد کی پیداوار ہے ورنہ یہ عہد "تیموریہ" یا "چغتائیہ" کہلاتا تھا) اس حیثیت سے یہ عہد حکمران خاندانوں کا عہد تھا۔ اور حکمران خاندانوں یا حکمران طبقوں میں معاشرے کے تمام مسلمان شریک نہیں ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ مسلمان معاشرہ بھی دوسرے جاگیردارانہ معاشروں کی طرح سماجی لحاظ سے مختلف طبقوں میں بٹا ہوا تھا. عزت و احترام کی بنیاد مال و دولت اور عہدے و مناصب ہوا کرتے تھے۔ جو لوگ حکومت میں شریک تھے اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے وہ بحیثیت جاگیردار ذرائع پیداوار پر قابض تھے اور اس حیثیت سے طاقت و دولت دونوں کے مالک تھے۔ اس طبقہ اعلیٰ کے بعد معاشرہ چھوٹے چھوٹے نچلے طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک وہ طبقہ تھا جو حکومت کے چھوٹے کارندوں اور عمال پر مشتمل تھا اور طبقہ امراء سے منسلک تھا۔ اس کے بعد دستکار ہنرمند اور کاریگر آتے تھے. اور آخر میں نچلے طبقے کے لوگ تھے جن میں کسان و کاشتکار اور مزدور شامل تھے۔ معاشرے کے ان مختلف طبقوں کو مذہب کا عنصر آپس میں ملائے ہوئے ضرور تھا. مگر سماجی سطح پر ان میں نہ تو مساوی تعلقات تھے. اور نہ ہی ثقافتی طور پر ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے تھے۔ طبقہ اعلیٰ جس ثقافت کا علمبردار تھا اس کے متحمل طبقہ ادنیٰ کے لوگ نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے غذا. لباس. مکان. زبان اور مجلسی آداب. ہر چیز میں یہ طبقے آپس میں کوئی مشترک عنصر نہیں رکھتے تھے۔

ایسی صورت میں مذہب کے ذریعہ تمام طبقوں کو صرف اس صورت میں متحد کیا جا سکتا تھا۔ جب کہ ان کے مقابلہ میں دوسری مذہبی قومیں اور گروہ ہوں۔ عہد وسطیٰ میں یہ صورت حال ہندوؤں سے جنگ کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی، اور اس لئے ایسے موقعوں پر حکمران طبقوں کی جانب سے کافروں سے جہاد کا نعرہ لگایا جاتا تھا. اور عام مسلمانوں کو اسلام کی بقا اور تحفظ کے لئے جنگ میں شریک ہونے اور جان دینے کی دعوت دی جاتی لیکن جیسے ہی یہ خطرہ ٹل جاتا اور بحران گزر جاتا. ملاپ کے اس عنصر کو پس پشت ڈال دیا جاتا تھا. اور پھر معاشرہ لسانی، ثقافتی، معاشی اور سیاسی مفادات کے تحت مختلف طبقوں میں بٹ جاتا تھا۔ اس کی مثال عہد سلاطین میں خسرو خاں کی بغاوت سے دی جا سکتی ہے۔ جب اس نے قطب الدین مبارک خلجی کو قتل کر کے دہلی کے تاج و تخت پر قبضہ کیا تو اس کے خلاف فوراً ہی مذہب کو استعمال کیا گیا اور اس کی حکومت کو ہندو مشہور کر کے مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکایا گیا۔ حالانکہ اس نے اپنے کسی عمل سے یہ ثابت نہیں کیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف تھا اور ہندو ریاست کا احیاء چاہتا تھا۔ مسلمان حکمران طبقوں کا یہ ردعمل اس لئے تھا کہ وہ ہندی نژاد مسلمان تھا. اور ایک نو مسلم کو یہ طبقے مساوی درجہ اور مقام دینے پر تیار نہیں تھے. اس لئے انہیں یہ خطرہ ہوا کہ حکومت ان کے ہاتھوں سے نکل کر نچلے، درجہ کے ہندی نژاد مسلمانوں یا نومسلموں کے ہاتھوں میں نہ چلی جائے۔ حالانکہ مسلمانوں کی کافی تعداد اس کے ساتھ تھی مگر انہیں ہم عصر مورخ ضیاء الدین برنی موقع پرست کہتا ہے اور اس کے امراء کو تین طبقوں میں تقسیم کرتا ہے. جو لوگ دولت کے لالچ میں اور ایمان کی کمزوری سے خسرو خاں کے ساتھ ہو گئے تھے. دوسرے وہ لوگ جو ظاہر میں ساتھ تھے مگر باطن میں اس کے خلاف تھے. تیسرے گروہ کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ یہ تعداد میں تو کم تھے لیکن راسخ العقیدگی اور ایمان میں پختہ تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

> "اس مختصر عرصے میں جب کہ خسرو خان بادشاہ تھا اور ہندوؤں ...... کے غلبے کے باعث شعار کفر ترقی پر تھا اور لوگوں کے دلوں میں اسلامی جذبہ افسردہ ہو گیا تھا یہ لوگ ...... دن رات ان بد دینوں کو ختم کر دینے کی تدابیر سوچتے رہتے اور ان کی بربادی کی دعائیں مانگتے رہتے۔" (۲)

☆ خسرو خان کا اقتدار میں آنا ہندی نژاد مسلمانوں اور ترک مسلمانوں کے درمیان ایک تصادم تھا جس میں بالآخر ترک کامیاب ہوئے اور انہوں نے اپنی برتری قائم کر لی۔

— ۲ —

ایک مرتبہ جب تاریخ میں "مسلمانوں کے عہد" کی اصطلاح کو تسلیم کر لیا گیا اور اس کی روشنی میں پورے عہد وسطیٰ کا مطالعہ کیا گیا، تو اس نے طبقاتی شعور کو ختم کر دیا اور ہر مسلمان اس عہد کو اپنی حکومت سمجھنے لگا اور اس قسم کے فقرے عام ہو گئے کہ "جب ہم نے ہندوستان پر حکومت کی" "ہمارے زمانہ" میں علم و ادب کی ترقی ہوئی۔ "ہمارا دور" تاریخ کا سنہری دور تھا۔ اس اصطلاح نے اس دور کو حکمران خاندانوں کی جگہ اجتماعی مسلمانوں کی حکومت بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر انفرادی مسلمان اس کو اپنی حکومت سمجھ کر اس کا دفاع کرنے لگا۔ اس عہد کی کمزوریاں اس کی کمزوریاں ہو گئیں۔ اور اس کی خوبیاں اس کے لئے باعث فخر ہو گئیں۔ مسلمان حکمرانوں کو اپنا سمجھ کر ان کے کارناموں پر فخر کرنے لگے اور ان کی تمام خرابیاں اور بداعمالیاں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ بلکہ ہر حکمران دیندار۔ روشن خیال اور روادار بن گیا۔ اور اس پر تنقید ذاتی سمجھی جانے لگی۔ بلکہ ان کی شخصیتوں میں انہیں اپنا پرتو نظر آنے لگا ان کی سامراجی پالیسیاں۔ ان کی جارحانہ جنگیں اور ان کی فتوحات کو وہ ماضی کا ورثہ سمجھنے لگے۔ اور حکمران طبقوں کے استحصال کو فراموش کر کے ان کی ثقافت و کلچر کا خود کو وارث گردانے لگے۔

تاریخ کے اس نقطہ نظر نے طبقاتی مفادات کو چھپا دیا۔ اعلیٰ و ادنیٰ کی تفریق، اشراف و اجلاف کا فرق اور خاندانی مسلمان اور نومسلم کے درمیان دوری۔ ان تمام پہلوؤں کو پس پشت دھکیل دیا گیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ دراصل حکمران شاہی خاندانوں کی تاریخ ہے۔ اگر تاریخ خاندانوں کے نام سے موسوم رہتی تو بادشاہ۔ فاتح۔ منتظم اور بڑے بڑے منصب دار و جاگیر دار تاریخ کا کردار ہوتے اور اس حیثیت سے ان پر تنقید کی جا سکتی تھی اور تجزیہ کے بعد ان کے بارے میں تاریخی حقائق کو بیان کیا جا سکتا تھا۔ اس صورت میں محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور معزالدین غوری تاریخ کی تنقید کی زد میں آ سکتے تھے۔ مگر ایک مرتبہ جب

انہیں تاریخ سے نکال کر مذہب کے دائرے میں لے جایا گیا تو پھر ان پر تنقید کرنا ممکن نہیں رہا، کیونکہ اب عقیدت نے ان کے گرد تقدس کا ہالہ بنا دیا اور اسلامی تاریخ عقیدت کا شکار ہو کر اپنا تاریخی کردار کھو بیٹھی۔

اگر تاریخ کا تجزیہ طبقاتی شعور کے ساتھ کیا جائے تو ایک عام مسلمان کو جس کا تعلق نچلے طبقے سے ہے، اسے اس بات پر فخر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہو گی کہ مسلمان حکمرانوں نے فتوحات کیں، مندروں کو مسمار کیا، بتوں کو توڑا اور کافروں کو شکستیں دیں۔ کیوں کہ اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ جنگیں اور فتوحات صرف ایک طبقے کے مفاد میں تھیں، کیونکہ ہر نئے علاقے کی فتح کے بعد امراء کے طبقے کو فائدہ پہنچتا تھا، انہیں جاگیریں ملتی تھیں، مال غنیمت میں حصہ ملتا تھا اور ان کے عہدوں و منصبوں میں اضافہ ہوتا تھا۔ اس نقطہ نظر سے یہ تمام جنگیں سامراجی ذہن کی پیداوار تھیں، جن کے پس منظر میں مذہبی جذبہ نہیں بلکہ مادی فوائد ہوتے تھے۔

اس نقطہ نظر سے اگر انتظام سلطنت اور حکمرانوں کی اصلاحات کو دیکھا جائے تو واضح ہو گا کہ ان کا مقصد حکمران طبقوں کے مفادات کا تحفظ تھا. مثلاً علاؤالدین خلجی نے شراب پر پابندی عائد کی اور ہندو زمینداروں میں دولت جمع نہیں ہونے دی۔ اس سے اس کا محض یہ مقصد تھا کہ اس کے خلاف جو بغاوتوں کا خطرہ تھا اسے روکا جائے۔ اسی طرح حکمرانوں کی شان و شوکت اور فیاضی و سخاوت کے تذکروں سے عام مسلمانوں کو متاثر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ شان و شوکت عام ہندو اور مسلمان کسان و کاشتکار کی محنت کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھی، اور ان کی مفلسی، غربت اور جہالت کی قیمت پر حکمران طبقے اپنی شاندار ثقافت کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔ طبقاتی نقطہ نظر سے یہ شان و شوکت قابل فخر نہیں بلکہ قابل نفرت تھی۔

— ۳ —

تاریخ میں طبقاتی کش مکش کو چھپانے اور اپنے مفادات کو فروغ دینے کے لئے مراعات یافتہ طبقوں نے اس مفروضہ کو پیدا کیا کہ چونکہ ہندوستان پر مسلمانوں نے حکومت

کی اس لئے اس پورے عرصہ میں ہندو ان کے غلام رہے۔ اس مفروضہ پر یقین کرتے ہوئے ایک عام انسان اس پر فخر کرتا ہے کہ اس نے ہندوؤں کو اپنا غلام بنائے رکھا تھا۔ حالانکہ تاریخی حقیقت ایک دوسری ہی تصویر پیش کرتی ہے۔ مسلمان حکمرانوں نے فتح کے بعد ہندوستان کے انتظامی ڈھانچہ کو اسی طرح برقرار رکھا اور ہندو زمینداروں کے اختیارات اسی طرح رہنے دیئے، کیونکہ اس صورت میں یہ ممکن ہوا کہ ہندو زمیندار نے مالیہ وصول کر کے حکومت تک پہنچایا۔ یہ ہندو زمیندار موروثی تھے اور اپنے اختیارات کی وجہ سے حکومت کے حکمران طبقے میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ یہ زمیندار مقدم، چوہدری، رائے اور رانا کہلاتے تھے اور گاؤں، دیہاتوں میں ان کی حکومت تھی۔ یہ سلطان کے ساتھ اس وقت تک وفادار رہتے تھے جب تک اس کے پاس طاقت ہوتی تھی۔ مرکز کی ذرا سی کمزوری دیکھ کر یہ بغاوت کر دیتے تھے اور مالیہ کی رقم حکومت کو ادا نہیں کرتے تھے۔ اس لئے اگر ترک و مغل اوپر کی سطح پر حکمرانی کرتے تھے تو نچلی سطح پر ہندو زمینداروں کی حکومت تھی جو اپنے علاقوں میں بالکل خود مختار تھے۔ اس کے علاوہ لاتعداد چھوٹی چھوٹی ہندو ریاستیں تھیں ان میں سے کچھ آزاد تھیں اور کچھ خراج دیتی تھیں لیکن اپنے اندرونی معاملات میں بالکل خود مختار ہوا کرتی تھیں۔

اس لئے اس حقیقت کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ عہد وسطیٰ میں حکمران کون تھے؟ اور رعایا کون؟ حکمران طبقوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی مگر ان میں ہندو بھی شامل تھے۔ جب کہ رعیت میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ مگر اس میں مسلمان اقلیت بھی شامل تھی اور ان کا تعلق محروم طبقے سے تھا۔ اس لئے اس چیز کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ عہد وسطیٰ میں مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ مسلمان حکمران خاندانوں کی حکومت تھی۔

اسی طرح تاریخ کا یہ مفروضہ بھی غلط ہے کہ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی کیونکہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا عروج ہوا تو اس وقت مغل سلطنت کمزور ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی اور اس کے پاس کوئی فوجی قوت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ انگریزوں سے مقابلہ کرتی۔ اس لئے اقتدار کی جنگ انگریزوں اور مغلوں کے درمیان نہیں ہوئی بلکہ یہ

جنگ مرہٹوں، سکھوں، جاٹوں اور راجپوتوں سے لڑی گئی۔ مرہٹوں کی شکست نے انگریزی راج کی راہیں ہموار کیں۔ (۳)

—۴—

تاریخی شخصیتوں اور ان سے پیدا ہونے والے مفروضوں نے ہندوستان کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا۔ تاریخ میں دو قسم کی شخصیتیں ابھرتی ہیں: ایک وہ جن کی تشکیل تاریخی واقعات اور ان کے پس منظر میں ہوتی ہے دوسری وہ جن کے گرد فرضی واقعات اور دیومالائی تصورات کا تانا بانا بن دیا جاتا ہے، اور یہ حقیقت سے دور ہو کر ایک دیومالائی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

پہلی قسم کی شخصیتوں کو ہم تاریخی اور حقیقی کہہ سکتے ہیں. یہ تاریخی واقعات کی چھان بین اور تجزیہ کے بعد ابھرتی ہیں، ان کی ذات میں اچھائیاں اور برائیاں دونوں ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ شخصیتیں جاذب اور دلکش بن کر نہیں ابھرتیں. اس لئے ان کے مقابلہ میں جو شخصیتیں تشکیل دی جاتی ہیں، وہ صرف نیکی کا مجسمہ، بہادری و جرات کا پیکر اور خوبیوں و نیکیوں کی مکمل تصویر ہوتی ہیں. یہ شخصیتیں تصوراتی و تخیلاتی رنگ آمیزی کے بعد اپنی تاریخی حیثیت کھو دیتی ہیں اور ان کی اصل شکل و صورت و رنگ و روپ ختم ہو جاتا ہے اور وہ ایک ایسی شکل میں نمودار ہوتی ہیں کہ جنہیں مفاد پرست طبقے اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ عوام کے دلوں میں ان کے لئے عزت و احترام پیدا کیا جاتا ہے اور انہیں علامت بنا کر ان کے گرد عوام کو جمع کیا جاتا ہے تاکہ اس عمل سے معاشرے میں طبقاتی کش مکش ختم ہو اور یہ شخصیتیں ان کے مقاصد کی تکمیل میں کام آئیں۔

برصغیر کی تاریخ میں جن شخصیتوں کو ابھارا گیا، اس سے اندازہ ہو گا کہ ان کے ذریعہ کون کون سے طبقے اپنے مفادات کا تحفظ کر رہے تھے۔ مثلاً اول ان فاتحین اور حکمرانوں کو ابھارا گیا جو ان کے افکار و نظریات سے ہم آہنگ ہوتے تھے. ان میں سے اکثر شخصیتیں خود اپنے زمانہ میں قابل احترام یا مشہور نہیں تھیں. اور بعد میں بھی انہیں مسلمانوں کے معاشرے میں بطور ہیرو تسلیم نہیں کیا گیا۔ مثلاً محمد بن قاسم، محمود

غزنوی اور معزالدین غوری کو پورے عہد سلاطین و عہد مغلیہ میں بطور ہیرو پیش نہیں کیا گیا اور نہ ہی ان کے کارناموں پر فخر کیا گیا۔ ان میں سے محمد بن قاسم کے ساتھ چچ نامہ کی روایت کے مطابق یہ سلوک کیا گیا کہ اسے زندہ کھال میں سلوا کر خلیفہ نے دربار میں بلوایا یا دوسری روایت کے مطابق اسے قید میں ڈال دیا گیا جہاں اسی حالت میں اس کی وفات ہوئی۔ اور اس کے اپنے عہد میں اس کی موت پر کوئی نوحہ کناں نہیں ہوا۔

یہی حال محمود غزنوی کا تھا کہ اس کی سامراجی پالیسی کی سزا اس کے جانشینوں کو ملی اور اس کے مرتے ہی غزنوی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ختم ہو گئی۔ محمود غزنوی کے سترہ حملے اور مندروں کی تباہی کا مواد صرف غزنوی مورخوں کے ہاں موجود رہا جب کہ ہندو معاشرہ بہت جلد اسے بھول گیا اور سومناتھ کا مندر دوبارہ تعمیر ہو گیا اور اس کی تباہی کی کوئی یاد گار باقی نہیں رہی لیکن ہندوستان کے فرقہ وارانہ ماحول میں دوبارہ اس کی شخصیت کو ابھارا گیا اور ہندوستان پر اس کے سترہ حملوں اور مندروں کی تباہی کو فخر کے ساتھ پیش کیا گیا تاکہ فرقہ پرستی کے جذبات پروان چڑھیں۔ (۴)

اس کے بعد جدید دور میں یہ کوشش شروع ہوئی کہ ہر مسلمان حکمران کو خالص اسلامی رنگ میں رنگ دیا جائے اور اس کے کردار کو اس طرح پیش کیا جائے کہ جس میں تمام اسلامی خصوصیات ہوں اور جو اسلامی شعار کا انتہائی پابند ہو. اس جذبے کے تحت سلطان التمش ، غیاث الدین بلبن. شاہ جہاں. اور اورنگ زیب کو صالح و متقی مسلمان کی حیثیت میں پیش کیا گیا۔

دوسرے درجہ میں ہمیں ان علماء کی شخصیات نظر آتی ہیں. جنہوں نے طبقہ اعلیٰ کے مفادات کو پورا کیا اور ہندوستان میں رہتے ہوئے علیحدگی کے جذبات کی نمائندگی کی اور ہندو و مسلمان کے درمیان بڑھتے ہوئے اشتراک کو روکا. ان میں احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ علماء کے شاندار کارناموں کی تاریخیں بیان کرنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ معاشرہ میں علماء کا اثر و رسوخ برقرار رہے اور ان کی عزت و احترام میں کمی نہ آنے دی جائے۔ علماء کے یہ کارنامے عقیدت کے نقطہ نظر سے لکھے گئے

تھے اس لئے یہ تخیلاتی و فرضی واقعات کا حسین مجموعہ ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں مسلمان معاشرہ ان دو قسم کی شخصیتوں میں پھنسا رہا، ایک فوجی و سیاسی شخصیتیں جو بہادری و شجاعت اور حکمران کی نمائندگی کرتی ہیں اور جن کی ذات سے اسے امید ہوتی ہے کہ ایک بار پھر اسی طرح فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گا، دوسرے علماء کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ وہ راہنمائی کے لئے ان کی جانب دیکھے۔ ان دونوں صورتوں میں وہ شخصیتوں کے جال میں گرفتار رہا، اور بحیثیت مجموعی اس میں کوئی اعتماد پیدا نہیں ہوا اور یہی وہ مقصد تھا جو مراعات یافتہ طبقہ حاصل کرنا چاہتا تھا کہ ان شخصیتوں کے سہارے وہ عوام کے راہنما بنے رہیں اور عوام کی قوت و توانائی کو اپنے مفادات کے حصول کے لئے استعمال کرتے رہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر مبارک علی (ترتیب و ترجمہ) تاریخ اور فرقہ واریت. لاہور ۱۹۸۶ء

۲۔ ضیاء الدین برنی. تاریخ فیروز شاہی (اردو ترجمہ) لاہور ۱۹۶۹ء ص۔ ۵۹۱

۳۔ تفصیل کے لئے دیکھئے. ڈاکٹر مبارک علی. تاریخ اور روشنی، لاہور ۱۹۸۶ء

۴۔ خلیق احمد نظامی: Some Aspects of Religion and Politics in India during thirteen century. Bombay, 1961 P-XIII

تاریخی پس منظر

ابتدا میں مسلمان ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے تھے لیکن تاریخ میں ان تاجروں کی آمد اور ان کی تجارتی سرگرمیوں پر ہمیں کوئی سنسنی خیز مواد نہیں ملتا۔ کیونکہ ان کی سرگرمیاں ہمیشہ پرامن حالات اور ماحول میں ہوئیں۔ اس لئے تاریخ میں ان کی آمد کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ حالانکہ کسی ملک میں ابھرتی ہوئی قوم کے تاجروں کی آمد انتہائی اہم ہوتی ہے اور یہیں سے سیاسی اقتدار کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ تاجر واپس جاکر اس ملک کی دولت. خوشحالی اور سیاسی صورت حال کا تذکرہ کرتے ہیں اور یہ تذکرے اور ان کے مشاہدات فاتحین کو ملک فتح کرنے پر اکساتے ہیں۔

مسلمان تاجروں نے بھی ہندوستان کے بارے میں ابتدائی معلومات بہم پہنچائی ہوں گی اور ان کی ہندوستان سے واقفیت. بحری راستوں کی دریافت اور جغرافیائی و سیاسی معلومات عربوں کے لئے انتہائی مفید ثابت ہوئی ہوں گی۔

اس لئے عربوں کے ہاتھوں سندھ کی فتح کوئی حادثاتی فتح نہیں تھی بلکہ اس کے پس منظر میں عرب فتوحات کا بڑھتا ہوا ریلا تھا۔ سندھ کی فتح کی کوشش حضرت عمرؓ کے زمانے سے شروع ہوئی اور بالاخر ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں یہ علاقہ فتح ہوا۔ سندھ پورے امیہ اور عباسی دور حکومت میں لاپرواہی کا شکار رہا اور یہاں ترقی کے کوئی اسباب پیدا نہیں ہوئے مرکز سے دور ہونے کی وجہ سے یہاں کے گورنر ایک لحاظ سے خود مختار تھے۔ اور عباسی خاندان کے زوال کے بعد یہاں پر خود مختار عرب سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ جنہیں خانہ جنگیوں نے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ اس لئے عربوں کی فتح کے اثرات صرف سندھ تک محدود رہے اور بقایا ہندوستان اس سے متاثر نہیں ہوا۔

جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد تجارت کی غرض سے تھی اس لئے پرامن تھی۔ سندھ میں عرب فوجی طاقت کے ساتھ آئے اور سیاسی طاقت کے ساتھ ہی یہاں کی اکثریت مسلمان ہو گئی جس کی وجہ سے عربوں کی فتح ان کے لئے باعث رحمت ہو گئی اور وہ ان کے مظالم اور خون ریزیوں کو بھول گئے۔ شمالی ہندوستان میں مسلمان ترکوں کی شکل میں آئے، اور یہاں پر ان کا مقابلہ راجپوتوں سے ہوا جو خود ترکوں کی طرح جنگ جو اور لڑنے والے تھے۔ اس لئے ان کے مقابلہ میں جو جنگیں ہوئیں وہ بڑی خونریز اور تباہ کن تھیں، اس کے نتیجہ میں قتل عام ہوئے، مندر لوٹے گئے، عورتوں و بچوں کو غلام بنایا گیا اور مال غنیمت لوٹا گیا۔ چونکہ شمالی ہندوستان کی آبادی مسلمان نہیں ہوئی اس لئے ان کے ذہن میں ان جنگوں کی تلخ یادیں باقی رہ گئیں۔ اور تاریخ، قصے کہانیوں، لوک گیتوں اور خاندانی یاد داشتوں کے ذریعے یہ تلخیاں سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہیں۔ اس لئے ترکوں اور مسلمانوں کا تصور جو شمالی ہند میں ابھرا وہ ظالم، سفاک، خون ریز، خون آشام اور لٹیرے کا تھا۔ اس لئے یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت و عداوت کی خلیج حائل ہو گئی۔

ہندوستان میں فتوحات کا دوسرا ریلا محمود غزنوی کی سپہ سالاری میں آیا۔ محمود غزنوی کی یہ جنگیں ذاتی نوعیت کی اور بے مقصد جنگیں تھیں۔ یہ ایک طرف وسط ایشیا میں اپنی سلطنت کی حدود بڑھا رہا تھا تو دوسری جانب ہندوستان میں خون ریزی کے ذریعے مال و دولت لوٹ رہا تھا۔ اس کی سلطنت کی بنیاد اس کی ذات اور شخصیت پر تھی اسی لئے اس کے مرتے ہی غزنوی سلطنت سمٹ کر ختم ہو گئی۔ شمالی ہندوستان کی فتح کا سہرا معزالدین غوری کے سر بندھتا ہے۔ لیکن غوری سامراجیت کی بنیاد بھی کسی اعلیٰ مقصد پر نہیں تھی، بلکہ یہ بھی ذاتی عظمت کے لئے تھی وہ ان فتوحات کے ذریعہ اپنے لئے ایک علیحدہ ریاست قائم کرنا چاہتا تھا۔

معزالدین کے بعد ترکوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت کی بنیاد ڈالی، اور اقتدار کو ترک امراء میں محدود کر کے ایک نسل پرست حکمران طبقہ پیدا کیا۔ تاریخی شواہد سے معلوم

ہوتا ہے کہ ان ترک امراء کے پیش نظر دولت کی لوٹ کھسوٹ اور عیش و عشرت سب سے بڑے مقاصد تھے. چنانچہ "امیر چہل گانہ" کی سرگرمیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اقتدار کے نشہ میں سلطنت کا امن و امان تباہ کر کے رکھ دیا۔ التمش کے جانشینوں تک ملک میں خانہ جنگی اور بدامنی رہی۔ اس کا خاندان ترکی امراء کی وفاداری کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں رہا. اس وجہ سے اس خاندان کی جڑیں مضبوط نہیں ہو سکیں اور بہت جلد یہ امراء کے ہاتھوں ختم ہو گیا۔

بلبن نے اقتدار میں آنے کے بعد بدامنی. خانہ جنگی اور امراء کی خود سری کو ختم کیا اور اپنے خاندان کو قدیم ایرانی بادشاہوں کے حسب و نسب سے ملا کر اسے قابل احترام بنانے کی کوشش کی اور دربار میں قدیم ایرانی رسومات کو رواج دے کر بادشاہ کی شخصیت کو پر رعب بنایا. لیکن اس کا بنایا ہوا حکمرانی کا یہ ڈھانچہ اس کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔ جلال الدین خلجی کا انقلاب البری ترکوں کی نسل پرستی کے خلاف ایک ردعمل تھا۔ علاؤالدین نے حکمران کو قتل کر کے اور دولت کے ذریعہ امراء کی حمایت حاصل کر کے ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی. اس لئے خود اس کے خلاف کئی بغاوتیں ہوئیں مگر یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ہر بار بچ گیا۔ سیاسی تبدیلیوں کے نتیجہ میں تغلق برسراقتدار آئے لیکن وہ بھی دہلی کی مرکزیت کو زیادہ عرصہ برقرار نہیں رکھ سکے اور تیمور کے حملے نے دہلی سلطنت کو ختم کر دیا جس کے نتیجہ میں گجرات. مالوہ اور جونپور میں خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں جب کہ دکن فیروز شاہ تغلق کے زمانہ ہی میں آزاد ہو چکا تھا۔ اگرچہ بعد میں سیدوں اور لودی خاندانوں نے کوشش کی کہ دہلی کی مرکزیت کو قائم کریں، مگر وہ ان کوششوں میں ناکام رہے۔

سلاطین دہلی کی کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے اقتدار کی بنیادیں مضبوط نہ کر سکے۔ ذاتی وفاداری اور عہدے و دولت کی بنیادیں وقتی اور کمزور ہوتی تھیں کیونکہ جب بھی امراء کو یہ توقع ہوتی کہ دوسرے امیدوار کے بادشاہ بننے کی صورت میں ان کے عہدوں میں اضافہ ہوگا وہ ذاتی وفاداری ختم کر کے اس کی حمایت کرتے اور اگر انہیں خود دوسرے امراء کی حمایت حاصل ہو جاتی تو بغاوت کر کے تخت پر قابض ہونے کی کوشش

کرتے۔

ابتدائی سلاطین نسلاً ترک تھے اور ان میں سے اکثریت غلاموں کی تھی. اس لئے حسب و نسب کی برتری اور فوقیت انہیں نہیں مل سکی۔ اگرچہ بلبن نے اپنی اعلیٰ نسبی کے بہت دعوے کئے. مگر اس کے ان دعووں کی بنیاد کھوکھلی ثابت ہوئی اور ان کا عوام پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ دوسرے ان ترک امراء کا پس منظر قبائلی تھا اس لئے یہ حکومت و اقتدار کلیتا ایک شخص کے سپرد کرنا نہیں چاہتے تھے اور مطلق العنان بادشاہت کے تصور سے مانوس نہیں تھے اس لئے ہر ترک امیر اپنی آزادی اور خود مختاری کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ یہی صورت حال آگے چل کر لودیوں اور سوریوں کے ساتھ پیش آئی کیونکہ ان میں بھی قبائلی روایات تھیں اور وہ جبر اور طاقت کے ذریعہ کسی ایک شخص کی حکمرانی تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے اس لئے دونوں صورتوں میں سلطنت ترک اور افغان امراء میں بطور جاگیر تقسیم ہو گئی۔ اور یہ اپنی جاگیروں میں بادشاہ کے احکامات سے بے بہرہ ہو کر خود مختار طریقہ سے رہنا چاہتے تھے۔ جب بھی کسی طاقت ور بادشاہ نے انہیں مرکزی حکومت کے ماتحت کرنا چاہا تو انہوں نے مسلسل بغاوتیں کر کے حکومت کی طاقت کو کھوکھلا کر دیا۔ لودی امراء ابراہیم لودی کی مطلق العنانیت سے اس قدر ناراض ہوئے کہ انہوں نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کی دعوت دے دی۔

چونکہ سلاطین کی حکومت کی بنیاد نسل پرستی پر تھی اس لئے ترک اور افغان ہندوستان میں بکھرے ہوئے ان مسلمانوں کو جن کا تعلق ان کی نسل سے نہیں تھا انہیں متحد نہیں کر سکے۔ ہندوؤں کی وہ برادریاں جو سیاسی، اقتصادی اور سماجی وجوہات کی بنیاد پر مسلمان ہو گئیں تھی، انہیں اس اتحاد میں شریک نہیں کیا گیا اگرچہ سلاطین خود کو اسلام کا محافظ کہتے رہے لیکن حکومت کے اقتدار میں انہوں نے مقامی مسلمانوں کو شریک نہیں کیا. یا غیر ترکوں کو کوئی مراعات نہیں دیں، اس کی مثال ملک یاقوت کی ہے کہ جسے رضیہ سلطانہ نے ذرا بڑا عہدہ دے دیا تو سارے ترک امراء اس کے خلاف ہو گئے. یا عمادالدین ریحان کی ہے جس نے تھوڑے وقت کے لئے بلبن کو. جب وہ ناصرالدین محمود کے زمانہ میں بااختیار

تھا. اقتدار سے ہٹا دیا، تو اس کے خلاف فوراً ہی ردعمل ہوا اور بلبن دوبارہ اقتدار میں آگیا۔ اس واقعہ کا اثر بلبن پر اس قدر ہوا کہ اس نے بادشاہ بننے کے بعد کسی ہندی نژاد مسلمان کو سلطنت میں کوئی اعلیٰ یا ادنیٰ عہدہ نہیں دیا اور نسل پرستی کی انتہاپسند پالیسی کو اختیار کیا۔

— ۲ —

ہندوستان میں مسلمان بحیثیت حملہ آور آئے، اس لئے انہوں نے یہاں جو جنگیں لڑیں ان کا مقصد علاقوں پر قبضہ کرنا. مال و اسباب کو لوٹنا اور فتح کے بعد اس کے فوائد سے بہرہ مند ہونا تھا۔ چونکہ حملہ آور ہمیشہ جارح ہوتا ہے اس لئے وہ جنگ میں کامیابی کے لئے بڑی بہادری اور بے جگری سے لڑتا ہے۔ کیونکہ صرف فتح اور کامیابی کی صورت میں اس کی بقا ہوتی ہے۔ اگر وہ شکست کھا جائے تو اس صورت میں اس کی تباہی مکمل ہوتی ہے۔ مسلمان حملہ آوروں نے جب ہندوستان پر حملہ کیا، تو انہوں نے فتح کی خاطر سخت خوں ریز جنگیں لڑیں اور فتوحات حاصل کیں۔

مگر جب یہی مسلمان ہندوستان کے مختلف علاقوں پر قابض ہو گئے اور وہاں انہوں نے اپنی حکومتیں قایم کر لیں تو ان کے رویہ اور رجحان میں تبدیلی آگئی. جب ان کے علاقوں پر حملے ہوئے تو اس وقت انہوں نے دفاعی جنگوں میں اس بے جگری کا مظاہرہ نہیں کیا جو کہ جارحانہ جنگوں میں کیا تھا۔ مثلاً بابر آسانی سے پانی پت کی جنگ میں ابراہیم لودی کو شکست دے دیتا ہے۔ مگر کنواعہ کی جنگ میں رانا سانگا سے اسے سخت مقابلہ پیش آتا ہے۔ یہی کچھ اس وقت ہوا جب کہ انگریزوں نے اپنے سیاسی اقتدار کے لئے ہندوستان میں جنگیں لڑیں. ان جنگوں میں مسلمان حکمرانوں نے انگریزوں کا مقابلہ اس شدت سے نہیں کیا جیسا کہ ہندوستانی قوموں نے کیا. جن میں مراٹھہ، سکھ، جاٹ اور راجپوت شامل تھے۔ مثلاً پلاسی کی جنگ میں مسلمان حکمران اپنی سلطنت کا دفاع نہیں کر سکا۔ ٹیپو سلطان نے اگرچہ سرنگاپٹم کے معرکہ میں جان دے دی. مگر اس کی فوج نے جنگ میں کوئی

زیادہ جوش و خروش نہیں دکھایا۔

اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے آخر مسلمانوں نے دفاع میں بے جگری سے دشمنوں کا مقابلہ کیوں نہیں کیا؟ جبکہ مقامی قوموں نے ہر حملہ آور اور جارح کے ساتھ سخت مزاحمت کی۔ اس کی وجہ یہ تھی ہندوستان قوموں کی جڑیں اس سرزمین میں تھیں۔ اس لئے انہیں اس سرزمین سے گہرا تعلق اور لگاؤ تھا اور جب اس ملک پر آفت آئی اور اس کے دفاع کی ضرورت پڑی تو انہوں نے اس کے بچانے کے لئے سخت مقابلے کئے۔ چونکہ مسلمانوں کی وفاداریاں ہندوستان سے باہر تھیں۔ اس لئے ان میں ایسا کوئی جذبہ نہیں تھا کہ جس کے تحت وہ ملک کا دفاع کرتے۔ اس وجہ سے مسلمانوں میں غداروں. مخبروں. اور ایجنٹوں کی کمی نہیں رہی اور جب بھی موقع ملا انہوں نے اپنے مفادات کے لئے ملک و قوم کا سودا کر لیا۔ بابر کو ابراہیم لودی کے مقابلہ میں اس لئے کامیابی ہوئی کیونکہ دولت خاں لودی اور دوسرے افغان امراء نے اس کے خلاف غداری کی اور بابر کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ سراج الدولہ کی ناکامی کی وجہ میر جعفر اور دوسرے امراء تھے جنہوں نے ذاتی مفادات کی خاطر انگریزوں سے ساز باز کر لی تھی اور یہی کچھ ٹیپو سلطان کے ساتھ ہوا۔ اس کی ایک اور عبرت ناک مثال نادر شاہ کے حملے کی ہے. جب وہ مغل بادشاہ سے معاہدہ کر کے واپس جا رہا تھا تو اس وقت ایک مغل امیر سعادت یار جنگ جس کا خاندان ایران سے آیا تھا اسے اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ دہلی پر قبضہ کرے اور وہاں کی جمع شدہ دولت کو لوٹے۔ چونکہ یہ امیر ایرانی الاصل تھا اس لئے اسے اہل ہندوستان کے قتل یا ان کی غارت گری سے کوئی غم نہیں تھا۔

یہ اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ جب مسلمانوں کا سیاسی زوال ہوا تو انہوں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہر ایک نے اپنے ذاتی مفادات کے تحت صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچا اور معاشرہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

— ۳ —

عہد سلطنت میں چونکہ حکمران خاندان بدلتے رہے اس وجہ سے ریاست کے ادارے مضبوط نہیں ہوئے اور حکمران خاندانوں کی تبدیلی ملک میں بے چینی کا باعث رہی۔ اندرونی بغاوتوں اور بیرونی حملوں نے عدم تحفظ کے احساس کو برقرار رکھا۔

مرکز کے کمزور ہونے کے نتائج بھی دور رس ہوئے۔ اس کے نتیجہ میں صوبائی حکومتیں قائم ہوئیں اور وہ تہذیبی و ثقافتی سرگرمیاں جن کا مرکز سے تعلق تھا. اس کے سیاسی زوال کے ساتھ ختم نہیں ہوئیں۔ بلکہ صوبائی حکومتوں نے انہیں فروغ دینا شروع کر دیا۔ تغلق خاندان کے خاتمہ کے ساتھ ہی گجرات. مالوہ اور جونپور کی ریاستیں تہذیب و ثقافت کا مرکز بن گئیں اور تیمور کی تباہ کاریوں کے بعد شاعروں. ادیبوں. ہنرمندوں اور فن کاروں نے ان صوبائی حکومتوں میں پناہ لی۔

مغل خاندان کو سلاطین کے مقابلہ میں اس لحاظ سے برتری رہی کہ اس خاندان کی بنیادیں وسط ایشیا اور افغانستان میں مضبوط تھیں اور تیموری خاندان کے حکمرانوں نے وفادار امراء کا ایک گروہ پیدا کر دیا تھا جنھوں نے اپنے مفادات ان سے وابستہ کر رکھے تھے۔ اس لئے جب بابر ہندوستان میں آیا تو وہ اپنے ساتھ اپنے وفادار امراء اور فوجیوں کو بھی ساتھ لایا۔ جن کی مدد سے اس نے ہندوستان میں مغل حکومت قائم کی۔

اکبر جب تخت نشین ہوا تو اس نے اس بات کا احساس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں تیموری حکومت کو اسی وقت استحکام مل سکتا ہے جب ہندوستان میں کوئی طاقت ور جماعت یا گروہ اس کی حمایت کرے۔ ہمایوں کی شکست نے اس بات کو واضح کر دیا تھا کہ صرف مغل امراء کی مدد سے حکومت نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے اس نے راجپوتوں کی حمایت حاصل کی تاکہ ان کی مدد سے نہ صرف مغل حکومت کو اندرونی طور پر مضبوط کرے بلکہ فتوحات کے ذریعہ سرحدوں کو بھی آگے بڑھائے۔

— ۴ —

سلاطین اور مغل بادشاہوں نے سلطنت کی وسعت کے لئے ہندوؤں اور مسلمان حکمرانوں سے جنگیں لڑیں۔ التمش نے ہندو راجاؤں کے ساتھ ساتھ ناصرالدین قباچہ اور تاج الدین یلدز کو شکست دے کر ان کی طاقت کا خاتمہ کیا۔ تو لودیوں اور جونپور کے شرقی سلاطین میں اقتدار کے لئے مسلسل جنگیں ہوتی رہیں۔ شیر شاہ سوری اور ہمایوں کے درمیان جنگ اور اورنگ زیب کی اپنے بھائیوں سے جنگیں اس امر کا ثبوت ہیں کہ اقتدار کی اہمیت مذہب سے زیادہ تھی۔

سلاطین دہلی اور مغل حکمرانوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ صوبائی حکومتوں کو ختم کر کے اپنی سلطنت کو وسیع کریں۔ مغلوں کے دور میں جو مسلمان ریاستیں بنگال، گجرات، خاندیش، دکن اور سندھ میں تھیں انہیں ایک ایک کر کے ختم کر دیا۔ جس وجہ سے ان علاقوں کی تہذیبی و ثقافتی ترقی متاثر ہوئی۔

مغلوں کی سامراجی پالیسی کو کامیاب بنانے میں اس کے منصب داری طریقہ کو بڑا دخل تھا۔ منصب داروں کی تنخواہیں اور مراعات اس قدر ہوتی تھیں کہ ان کی جانب سے مغل حکومت یا مغل بادشاہ کو بغاوت کا کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی پوزیشن اور مراعات کے تحفظ کے لئے مغل خاندانوں کی بقا ضروری سمجھتے تھے۔

سامراجیت کی پالیسی اور مسلسل جنگوں کی وجہ سے حکومت کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ ایک مضبوط فوج مستقل طور پر تیار رکھیں۔ اس فوج کے اخراجات کے لئے بھی ضروری تھا کہ وہ مسلسل جنگوں کے ذریعہ نئے نئے علاقے فتح کریں۔ اس لئے سلاطین اور مغلوں کے پورے عہد میں جنگ و جدل اور فتوحات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو مغل سلطنت کے زوال تک جاری رہا۔

مسلسل جنگوں اور وسعت سلطنت کی پالیسی نے مسلمان معاشرے کی ذہنی ساخت کو بنانے میں اہم حصہ لیا فوجی ملازمت سب سے زیادہ قابل احترام ٹھہری اور جنگ میں بہادری و شجاعت و تہوری اعلیٰ صفات قرار پائیں۔ اس لئے ہر مغل منصب دار چاہے وہ منتظم ہو، شاعر و ادیب ہو یا سفارت کار ہو اس کے لئے فن سپہ گری میں مہارت ضروری تھی۔ اکبر

کے دربار کے دانشور ابو الفضل نے میدان جنگ میں جان دینا گوارہ کر لیا مگر راہ فرار اختیار نہ کی۔ چونکہ فوج میں اکثریت مسلمانوں کی ہوتی تھی، اس لئے فوجی پیشہ ان کے لئے سب سے زیادہ باعزت بن گیا۔ فوج کے قیام کے ساتھ ہی اس کی ضرورتوں کو بھی پورا کرنے کے لئے معاشرہ میں ایسی صنعتوں کا عروج ہوا، جن کا تعلق فوج سے تھا۔ مثلاً تلوار، تیر کمان، زرہیں، خنجر و جمدھر۔ ان صنعتوں میں کاریگر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگے، گھوڑوں کی درآمد اور ان کی پرورش و تربیت دی جانے لگی۔ شامیانوں و خیموں کی صنعت کو فروغ ہوا۔ فوج کے ساتھ ساتھ پورا بازار چلتا تھا جہاں ضرورت کی ہر چیز دستیاب ہوتی تھی۔ بنجارے خاص طور سے فوج کو رسد مہیا کرتے تھے۔ فوجی افسروں کی سہولت و آرام کی خاطر ملازموں کی ایک بڑی تعداد ہوتی تھی۔ جن میں باورچی، گاڑی بان، پالکی اٹھانے والے کہار اور ذاتی خدمت گار ہوا کرے تھے۔ فوجی اخراجات کے بڑھنے کی وجہ سے معاشرہ کے اقتصادی حالات خراب ہوئے اور دولت گاؤں اور دیہاتوں سے کھنچ کر شہروں میں آنے لگی۔

مسلمان حکمرانوں نے جب دور دراز کے علاقے فتح کئے تو وہاں مسلمانوں کو آباد کیا اور ان کی وجہ سے کچھ مقامی لوگوں نے اپنے مذہب بھی تبدیل کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی جماعتیں پورے ہندوستان میں بکھر گئیں۔ یہ بکھری ہوئی جماعتیں عدم تحفظ کا شکار رہیں کیونکہ مرکز کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ان کی حفاظت کر سکے۔ اس لئے یہ فرقہ وارانہ فضا سے ہمیشہ دوچار رہتے تھے۔

مسلمان حکمرانوں کا یہ بھی دستور تھا کہ وہ فتح کے بعد یادگار کے طور پر مفتوحہ علاقوں میں مسجدیں تعمیر کراتے تھے اس لئے یہ مسجدیں ان علاقوں میں بھی تعمیر ہوئیں جہاں مسلمانوں کی آبادی بالکل نہ تھی۔ اکثر یہ مسجدیں مندروں کو توڑ کر یا مندر کو تقسیم کر کے بنائی گئیں تھیں یا مندر کے بالکل قریب بناتے تھے اس کے نتیجہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہمیشہ تنازعہ رہا، اور مغل سلطنت کے زوال کے بعد اس قسم کے فسادات عام ہو گئے۔

مغلوں کا یہ دستور تھا کہ فتوحات کے بعد اکثر وہ علاقے اسی ریاست کے حکمران کو دے دیتے تھے یا بڑے بڑے زمینداروں کی موروثی حیثیت کو برقرار رکھتے تھے اس لئے یہ حکمران اور زمیندار اپنی جائدادوں اور مراعات کی خاطر مغلوں کی حمایت کرتے تھے. اس لئے مغل سامراج کی بنیاد ہر علاقہ میں حمائتیوں کے گروہ پر ہوتی تھی۔

— ۵ —

مغل سلطنت کی خوشحالی اور استحکام کی بنیادیں امراء کی وفاداری اور تاجروں و کاشت کاروں کے تحفظ پر تھیں۔ کاشت کاری اور تجارت مغل حکومت کی آمدنی کے دو بڑے ذریعہ تھے۔ جن پر ان کی حکومت کے اداروں کی بنیادیں تھیں۔

مغل حکومت کا زوال اس وقت شروع ہوا جب امراء خانہ جنگیوں میں مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور ان کی وفاداری حکومت کے امیدواروں کے درمیان بٹ گئی۔ اس تقسیم سے مغل سلطنت کا ایک اہم ستون ٹوٹ گیا۔

مغل سلطنت کے زوال کا دوسرا اہم سبب کاشتکاری و زراعت میں رکاوٹ اور تجارت کی کمی تھا۔ جب سیاسی طور پر افراتفری پھیلی تو ملک کے راستے محفوظ نہیں رہے اور تجارتی قافلے آزادی اور حفاظت سے ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں آ سکتے تھے۔ سمندر ان کے لئے غیر محفوظ ہو گئے کیونکہ سمندری راستوں پر سمندری ڈاکوؤں اور یورپی اقوام کا کنٹرول تھا۔ اور عثمانی حکومت اور عرب ممالک میں سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے ان کے ساتھ تجارت میں کمی آئی۔ جس نے تاجر طبقہ کے ساتھ ساتھ ملک کے مالی وسائل میں کمی پیدا کی۔ (۱)

جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں عروج ہوا تو اس نے مغل بادشاہوں اور مقامی ریاستوں کے حکمرانوں سے اپنے لئے تجارتی مراعات حاصل کر لیں. جس کی وجہ سے مقامی تاجران کا مقابلہ نہیں کر سکے اور انہیں تجارت میں نقصان ہونے لگا۔

انتظام سلطنت کے انتشار اور تخت و تاج کے لئے خانہ جنگیوں نے نظام

جاگیرداری پر ایک کاری ضرب لگائی. فوجوں کی نقل و حرکت نے کھیتوں کو تباہ کرنا اور گاؤوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغل سلطنت کے اہم ذرائع آمدنی ختم ہو گئے یا کم ہو گئے۔ صوبوں کے گورنر آزاد ہوتے چلے گئے اور انہوں نے یا تو خراج دینا بند کر دیا یا اپنی مرضی اور سہولت سے تھوڑا بہت دینے لگے۔ چونکہ مغل سلطنت کا پھیلاؤ اس قدر تھا اور اس کی شان و شوکت اس قدر عروج پر جا چکی تھی کہ آمدنی کی کمی نے اس کی مستحکم عمارت میں دراڑیں ڈال دیں اور مغل سلطنت اپنی شان و شوکت کے بوجھ تلے دب کر اپنی توانائی اور طاقت کھو بیٹھی۔

سیاسی ابتری اور فوج کی کمزوری کی وجہ سے مغل امراء اپنی جائدادوں سے مالیہ اور لگان وصول نہیں کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کی مالی حالت متاثر ہوئی اس لئے انہوں نے معاشرہ میں جو معیار زندگی مقرر کر رکھا تھا اسے برقرار رکھنے کے لئے انہوں نے اپنی جائدادیں اور حویلیاں رہن رکھنا شروع کر دیں اور مہاجنوں سے قرضہ لینا شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ مغل بادشاہ بھی مہاجنوں سے قرضہ لیتے اور اپنے اخراجات پورے کرتے تھے۔ اس لئے وہ خود اپنی شان و شوکت تلے دبتے چلے گئے۔ حویلیاں اجڑتی گئیں اور نوجوان نسل جہالت و جرائم میں پھنستی چلی گئی۔

مغل امراء کے ساتھ ہی اس صنعت و حرفت کو بھی زوال آیا جس کا تعلق امراء کی ضروریات سے تھا. جیسے ہتھیار. لباس. جواہرات. زیورات اور خوشبوئیں وغیرہ۔ چونکہ امراء کی قوت خرید کم ہونے لگی اس لئے ان سے متعلق لوگ بے روزگار ہونے لگے۔ اس معاشی و اقتصادی بدحالی نے ادب ثقافت اور سماجی سرگرمیوں کو بھی متاثر کیا کیونکہ دربار اور امراء ان کے سرپرست ہوتے تھے جب ان کی مالی حالت خراب ہوئی تو شاعروں ادیبوں. مصوروں اور موسیقاروں نے سرپرستی کی نئی جگہوں کی تلاش شروع کر دی۔

—٦—

مغل سلطنت کا سیاسی زوال تو ہوا. مگر مغل تہذیب اس کے ساتھ ختم نہیں ہو گئی

بلکہ یہ اب تک دہلی، لاہور اور چند بڑے مغل شہروں میں تھی. وہاں سے بکھر کر قصباتی شہروں میں پھیل گئی۔ ایک تو جگہ جگہ مسلمان خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں. جن کے دربار اب علم و ادب اور سماجی و ثقافتی سرگرمیوں کے مرکز بن گئے. اور شاعر و فن کار سرپرستی کی تلاش میں فیض آباد، لکھنؤ، حیدر آباد دکن. فرخ آباد، رام پور اور اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں جانے لگے جہاں انہیں خوش آمدید کہا گیا۔ اسی وجہ سے ان صوبائی شہروں میں زندگی سے بھرپور ثقافت پیدا ہوئی۔

دوسرا اثر یہ ہوا کہ مغل منصب دار اور جاگیر دار اس آخر دور میں چھوٹے چھوٹے شہروں میں رہائش پذیر ہو گئے اور جلد ہی یہ قصباتی شہر سماجی و ثقافتی سرگرمیوں کی وجہ سے اہمیت اختیار کر گئے۔ انہوں نے اپنے رہائشی شہروں میں مکتب و مدرسے کھولے. مساجد. مقبرے. باغات اور محلات تعمیر کرائے۔ ثقافتی زندگی کو رنگین بنانے کی غرض سے مشاعرے، مناظرے اور علمی مباحثہ منعقد کرائے جاتے تھے۔ تفریحوں میں کشتی کے مقابلہ ہوتے تھے اور تمام تہوارِ بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے بزرگوں اور صوفیوں کے عرس ہوتے اور ان موقعوں پر قوالی کی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔

صنعت و حرفت اور تجارت کی غرض سے ان امراء نے گنج اور بازار تعمیر کرائے جہاں ہندوستان بھر سے تاجر اپنا مال لاتے تھے اور وہ ہنرمند اور کاریگر جو مغل شہروں میں بے روز گار تھے انہوں نے ان قصباتی شہروں کی طرف رخ کیا جہاں وہ اپنے گزارہ کے مطابق کمائی کر سکتے تھے۔

ان قصباتی شہروں میں امراء کے یہ خاندان ثقافتی و مالی لحاظ سے انتہائی اہم بن گئے۔ اور ان کی سماجی حیثیت دوسرے طبقوں کے مقابلہ میں زیادہ اونچی ہو گئی یہ خاندان اپنے شہروں کے نام سے مشہور ہوئے۔ جیسے کاکوری شیخ. سادات. بارھ اور کڑہ کے سید وغیرہ۔ قصبوں میں رہنے والے خاندانوں میں وطن کا تصور اور اس سے محبت پیدا ہوئی۔ ۱۷۵۰ء میں مصنف و شاعر وطن کی تعریف میں لکھنے لگے اسی عہد میں ان شہروں کی تاریخیں لکھی گئیں۔ جیسے بلگرامی. کاکوری وغیرہ۔ (۲)

ان قصبوں میں سماجی طور پر معاشرہ بٹا ہوا تھا۔ اشراف کا تعلق زمینداروں اور مذہبی علماء کے گروہ سے تھا جو شادی بیاہ کے ذریعہ ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ نچلا طبقہ اجلاف کہلاتا تھا اور یہ مزدوروں اور کاریگروں پر مشتمل تھا۔ اشراف کا طبقہ چونکہ مالی لحاظ سے ذرائع پیداوار پر قابض تھا. اس لئے یہ سماجی و ثقافتی سرگرمیوں پر بے تحاشا روپیہ خرچ کرتا تھا۔ مثلاً ۱۸۱۰ء میں پٹنہ ڈسٹرکٹ میں اٹھارہ امراء کے خاندان تھے جن کے ساتھ ۱۰۰ خاندانوں کے افراد ملازم ہوا کرتے تھے۔ یہ اپنے اوپر ۲ لاکھ روپیہ سالانہ خرچ کرتے تھے۔ جب کہ اس کے مقابلہ میں تیس ہزار غریب خاندان اپنے اوپر سالانہ ٦ لاکھ روپیہ خرچ کرتے تھے۔ (۳)

—۷—

اس آخری عہد میں مغل معاشرہ زوال کی وجوہات ڈھونڈنے میں مصروف تھا۔ امراء کا طبقہ اس بات کا خواہش مند تھا کہ اس سیاسی زوال کے عمل کو روک کر دوبارہ سے مغل سلطنت کی عظمت کو بحال کیا جائے۔ مغل معاشرہ اور معاشرہ کے زوال کی وجوہات تلاش کرنے میں علماء نے بھی ان کی مدد کی اور انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان میں مغل سلطنت اور معاشرہ کے زوال کی اہم وجہ ان کی مذہب سے دوری ہے۔ مذہب سے یہ دوری اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی رسومات، طور طریق اور رسم و رواج کو اختیار کر لیا۔ وحدت الوجود کے نظریہ کی مقبولیت نے اسلامی معاشرہ کا تشخص مٹا دیا. کیونکہ اس نے مومن و غیر مومن کی تفریق کو مٹا کے مذہبی اختلافات کو ختم کر دیا۔ شیعت کے فروغ نے سنی نظام کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا. اس صورت حال کا جائزہ ایک مذہبی عالم اور صوفی قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے ان الفاظ میں لیا ہے۔

> ''کفر کے غلبہ سے دل تنگ ہے۔ ہندوستان میں مدت مدید سے اسلام ضعیف ہو گیا ہے. روافض کے تفوق'' ''آسیب سکھاں'' ''تسلط مرہٹہ'' ''کفری رسومات کا ظہور'' اور ''مسلمانوں کی مغلوبی'' تو بہت ہی افسوس کی

بات ہے۔ "

اس لئے ان علماء کے نزدیک اس زوال کو اسی وقت روکا جاسکتا تھا کہ ایک ایسی سنی ریاست وجود میں آئے کہ جس میں قرآن و حدیث کے احکامات پر عمل ہو، شریعت اسلامی کا نفاذ ہو، غیر مسلموں کو اعلیٰ عہدوں سے خارج کر دیا جائے، ان سے جزیہ وصول کیا جائے اور کافروں سے مسلسل جہاد کیا جائے۔ شاہ ولی اللہ بادشاہوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

"اے بادشاہو! ملاء اعلیٰ کی مرضی اس زمانہ میں اس امر پر مستقر ہو چکی ہے کہ تم تلواریں کھینچ لو اور اس وقت تک نیام میں داخل نہ کرو جب تک مسلم مشرک سے بالکلیہ جدا نہ ہو جائے اور اہل کفر و فسق کے سرکش لیڈر کمزوروں کے گروہ میں جاکر شامل نہ ہو جائیں۔ اور یہ کہ ان کے قابو میں کوئی ایسی بات نہ رہ جائے جس کی بدولت وہ آئندہ سر اٹھا سکیں...... اسلام کا کھلے بندوں اعلان ہو، اور اس کے شعائر کا اعلانیہ اظہار کیا جائے۔ " (۵)

شاہ ولی اللہ نے آخری عہد مغلیہ میں ان مسلمان فوجی مہم جوؤں سے جو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے جنگ میں مشغول رہتے تھے، ان کی جنگوں کو بھی جہاد کہا، محض اس لئے کہ ان کی یہ جنگیں اکثر ہندوؤں سے ہوتی تھیں۔ پائندہ خاں روہیلہ کو انہوں نے "رفعت مآب المجاہد فی سبیل اللہ" مخاطب کیا۔ سہارنپور کے فوجدار خان زمان خاں کو ایک خط میں لکھا کہ "خدا تبارک و تعالیٰ مجدد قانون شجاعت و دلاوری خان عالی مرتبہ خان زمان خاں جیو کو مدت مدید تک اہل کفر کی مخالفت میں مظفر و منصور رکھے۔ " (۶)

لیکن ان علماء کی یہ کوششیں معاشرہ کے زوال و سیاسی انحطاط کو نہیں روک سکیں، کیونکہ زوال کے اسباب میں مذہب سے دوری اہم نہیں تھی، کیونکہ جب سلاطین اور مغلوں کی حکومتیں اپنے عروج پر تھیں اس وقت بھی حکمران طبقے مذہب سے اتنی ہی دور تھے جتنے کہ زوال کے وقت۔ لیکن عروج کے عہد میں علماء نے مذہب کی دوری کو اس قدر زور و شور

سے بیان نہیں کیا، لیکن جب حکومت و طاقت جاتی رہی تو انہوں نے احیاء کے لئے حکمران طبقوں اور عام مسلمانوں کو ان نعروں سے ابھارا کہ ان کے زوال کا سبب مذہب سے بیگانگی ہے اور اگر مسلمانوں نے اسلام کی تعلیم پر عمل کیا تو زوال کا عمل رک جائے گا۔

مسلمان خاندانوں کے اس پورے دور میں علماء اپنی مذہبی تنگ نظری اور محدود نقطہ نظر کی وجہ سے معاشرہ کے سیاسی، معاشی اور سماجی عمل کو نہیں سمجھ سکے. اور اسی لئے ان کی تعلیمات سے زوال پذیر حکومتی اداروں کو کوئی استحکام نہیں مل سکا. اور جب بھی مسلمان بادشاہ سیاسی و معاشی بحران میں مبتلا ہوئے علماء نے ان کے مسائل کو حل کرنے میں ان کی کوئی مدد نہیں کی، اور وہ تمام سلاطین جنھوں نے علماء و صوفیاء کی سرپرستی کی وہ مصیبت کے وقت ان سے کوئی مدد حاصل نہیں کر سکے بلکہ عوامی فلاح و بہبود کا کام بھی ان بادشاہوں نے کیا جو علماء کی دسترس سے دور رہے۔ اس سلسلہ میں پروفیسر حبیب دو مثالیں دیتے ہیں:

> "التمش صوم و صلوٰۃ کا بڑا پابند تھا اور اس کے روابط صوفیائے وقت سے بھی نہایت عقیدت مندانہ تھے لیکن اس تقدس نے نہ تو اس کے متقی لڑکے کو کوئی مدد بہم پہنچائی اور نہ بلبن ہی کو اپنے آقا کے خاندان کا خون بہانے سے باز رکھا بلبن کی مذہبی رسوم کی پابندی بھی...... بلبن کے لئے مفید ثابت نہ ہوئی۔ اس کے برعکس علاؤ الدین خلجی ، جو سلاطین دہلی میں سب سے زیادہ کامیاب حکمران ثابت ہوا، حالانکہ صوم و صلوٰۃ کا پابند نہیں تھا لیکن پھر بھی عوام میں اس کی بابت مشہور تھا کہ خدا نے اسے کرامت کی قوت عطا کی ہے۔ محمد تغلق کے مذہبی اجتماعات بھی اس کی مخالفت کو فرو نہ کر سکے ...... فیروز شاہ کی غیر معمولی مذہبیت نے اس کی شہرت کو تو خوب ترقی دی لیکن روز بروز کمزور ہوتی ہوئی حکومت کو اس سے کوئی سہارا نہ مل سکا۔" (۷)

اس نقطہ نظر کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ معاشرہ کے زوال کے عمل میں جو سیاسی، معاشی اور سماجی عوامل کام کر رہے تھے ان کا تجزیہ نہیں کیا گیا۔ مذہب سے دوری

کے اس مفروضہ نے علماء کے اثر و رسوخ کو تو بڑھانے میں ضرور مدد دی، مگر یہ معاشرے کی تباہی کو نہیں روک سکے اور نہ اس تبدیلی کو دیکھ سکے جو یورپ میں ہوئی تھی اور جس کے اثرات ہندوستان کے معاشرے پر ہوئے تھے۔ وہ اس حقیقت کو بھی نہیں سمجھ سکے کہ ہندوستانی معاشرہ ایک جگہ جامد ہو کر اپنی تخلیقی صلاحیتیں کھو چکا تھا۔ ایسی صورت میں مسلمان معاشرہ چاہے روحانی طور پر کتنا ہی بلند واقع کیوں نہ ہوتا، وہ نئی سائنسی اور تکنیکی تبدیلیوں کے آگے نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

—۸—

ہندوستان میں مسلمان حکمران طبقے جن میں شاہی خاندان اور امراء و علماء شامل تھے ان کی وفاداری کا سیاسی اور مذہبی مرکز ہندوستان سے باہر رہا۔ عربوں کی فتح کے بعد سندھ کے گورنر اور حکام امیہ اور عباسی خلافت کے ماتحت ہوا کرتے تھے۔ بعد میں جب یہاں خود مختار عرب حکومتیں قائم ہوئیں تو بھی انہوں نے عباسی خلیفہ کو اپنا سیاسی اور روحانی پیشوا تسلیم کیا اور خطبہ میں اس کا نام پڑھوایا۔

شمالی ہندوستان میں جب ترکوں کی حکومت قائم ہوئی تو انہوں نے بھی اپنا تعلق ہندوستان سے باہر رکھا اور ان کی سیاسی وفاداریاں غزنی و غوری خاندانوں سے برقرار رہیں۔ جب یہ تعلق ختم ہوا تو دہلی کے سلاطین بغداد اور پھر قاہرہ کے خلیفہ سے اپنے لئے سند حکومت منگاتے رہے۔ خطبہ میں اس کا نام پڑھا جاتا تھا اور سکہ پر بھی بطور سیاسی و روحانی پیشوا اس کا نام ضرب ہوتا تھا۔

مغلوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں عثمانی خلافت سے اپنا تعلق قائم نہیں رکھا۔ لیکن مغل زوال کے بعد اسلامی خلیفہ کا نام ہندوستان میں خطبہ میں پڑھا جانے لگا اور ہندوستان کے مسلمانوں کی وفاداریاں پھر ہندوستان سے باہر ہو گئیں۔

ہندوستان سے باہر سیاسی اور مذہبی وفاداری کے مرکز کی وجہ سے حکمران خاندان کے اپنے لئے وفاداری کے جذبات کمزور ہو گئے اور مسلمان رعیت اصل طاقت کے مرکز کو

ہندوستان سے باہر سمجھنے لگے۔ اس سے حکمرانوں کی اپنی حیثیت کمزور ہوئی لیکن انہوں نے علماء اور مسلمان رعیت کی خوشنودی کے لئے اسے برقرار رکھا۔ مثلاً جب محمد تغلق کے خلاف بغاوتیں ہوئیں تو اس نے خلیفہ سے سند حکومت منگا کر ان بغاوتوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

مغل بادشاہ جب تک طاقت ور رہے، ہندوستان کے مسلمان حکمران طبقے خود کو محفوظ سمجھتے رہے، مگر جب ایک مرتبہ یہ طاقت ٹوٹی تو ان کا تحفظ بھی کمزور ہو گیا اور انہوں نے تحفظ کے لئے خلیفۃ المسلمین کی جانب دیکھا یہاں ایک بار پھر برصغیر کے مسلمانوں میں تاریخی شعور کی کمی نظر آتی ہے کیونکہ عثمانی سلطنت بھی مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ زوال کے عمل سے گزر رہی تھی۔ اور عثمانی خلافت کا ادارہ بوسیدہ و خستہ ہو کر گر رہا تھا اور اس قابل نہیں تھا کہ اپنا یا ہندوستان کے مسلمانوں کا تحفظ کر سکے۔ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کو خلیفہ سے یہ عقیدت اس وقت تک رہی جب تک کہ اس کا ۱۹۲۴ء میں خاتمہ نہیں ہو گیا۔

— ۹ —

مسلمان حکمران مطلق العنان ہوا کرتا تھا۔ اس کی طاقت اور قوت کو چیلنج کرنے والے یورپ کی طرح بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار نہیں ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ امراء کا طبقہ بادشاہ کی مرضی کا پابند تھا۔ وہ انہیں عہدے و منصب دیتا۔ جاگیریں عطا کرتا اور ان کی ترقی و تنزلی اس کی مرضی اور خواہش پر ہوا کرتی تھی۔ وہ انعام داد و عیش اور سزاؤں میں بالکل خود مختار تھے اور کسی قانون کے پابند نہیں تھے۔ اکبر جیسے روشن خیال حکمران نے بھی ایک شخص کو محض اس جرم میں سزائے موت دے دی کہ وہ رات کو جلتی ہوئی شمعوں کی دیکھ بھال نہ کر سکا اور سو گیا۔ جہانگیر نے معمولی جرم پر ایک زندہ شخص کی کھال کھنچوالی۔ سزاؤں میں ہاتھی کے پیروں تلے روندنا اور اذیت سے قتل کرانا ان کی مطلق العنانیت کا ایک پہلو تھا۔

تخت و تاج کی وراثت کا کوئی قانون نہیں تھا. اس لئے جس کے پاس طاقت ہوتی تھی وہ وارث قرار پاتا تھا۔ اس لئے اگر غاصب کا بھی طاقت کے ذریعہ حکومت پر قبضہ ہو جاتا تو اسے جائز حکمران تسلیم کر لیا جاتا تھا اس کی دلیل یہ دی جاتی تھی کہ بغاوت کے نتیجہ میں انتشار اور افراتفری پیدا ہو گی اس لئے ہر اس غاصب کو جس کے پاس طاقت ہے اسے حکمران مان لیا جائے۔ کیونکہ فوجی طاقت کو قوت کا مرکز مانا جاتا تھا اس لئے معاشرہ کا ذہن اس بات پر تیار ہو گیا تھا کہ امن و امان اور تحفظ کا ذریعہ فوجی طاقت اور طاقتور شخصیت ہے اس لئے جب علاؤالدین خلجی نے اپنے چچا جلال الدین خلجی کو قتل کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا تو ساتھ ہی لوگوں میں کثرت سے روپیہ پیسہ تقسیم کر کے انہیں اپنا ہم نوا بنایا۔ "روپیہ پر لوگ اس قدر فریفتہ ہو گئے تھے کہ سلطان علاؤالدین کی قبیح حرکت اور اس کے کفران نعمت کا ذکر تک کوئی زبان پر نہیں لاتا تھا" (۸)

اس لئے ایک مرتبہ جو بھی تخت پر بیٹھ جاتا. لوگ فوراً اپنی وفاداریاں بدل کر اس کے ساتھ ہو جاتے تھے۔ جب اکت خاں نے علاؤالدین پر قاتلانہ حملہ کیا اور یہ سوچ کر کہ وہ ختم ہو گیا ہے. تخت پر بیٹھا تو لوگ فوراً اس کے ساتھ ہو گئے۔

"ہاتھیوں پر عماریاں کسی گئیں اور وہ درگاہ سلطان کے سامنے لائے گئے۔ دربار کے ملازمین بھی آ گئے ...... نقیبوں نے آوازیں لگانا اور چلانا شروع کیا۔ مقریان قرآن پڑھنے لگے اور مطرب گانا گانے لگے۔ ان بزرگوں یعنی امراء وغیرہ نے جو شکار گاہ میں موجود تھے بادشاہ کو مبارک باد پیش کرنے کے لئے اس بدنصیب کی دست بوسی کی اور آداب بجالائے". (۹)

مسلمان حکمران اپنی مسلمان رعیت کو خوش کرنے کے لئے اس بات کو ضروری سمجھتا تھا کہ وہ مذہبی امور سرانجام دے۔ اس سلسلہ میں وہ خاص طور سے جلوس کی شکل میں جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں شرکت کرتا تھا. حکومت کے مذہبی اداروں پر علماء کا تقرر کر کے ان کی حمایت حاصل کرتا تھا۔ علماء کو وقتاً فوقتاً کھانے پر بلا کر ان سے مذہبی گفتگو کرتا اور جہاں مناسب ہوتا ان سے فتویٰ طلب کرتا. اس وجہ سے علماء کی

جماعت اس کی حمایت کرتی۔

اس کے علاوہ صوفیاء کے لئے خانقاہیں تعمیر کرانا. انہیں تحفہ تحائف بھیجنا. سیدوں کی عزت کرنا، مزاروں کی زیارت کرنا اور مذہبی تہواروں کو شان و شوکت سے منانا اس کا دستور تھا۔

مذہب سے لگاؤ اور عقیدت کی ایک حد مقرر تھی. جب اس کی ذات اور حکومت کو خطرہ ہوتا اور اس وقت مذہب اس کی راہ میں ذرا بھی رکاوٹ ہوتا تو وہ اس سے روگردانی کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس لئے شریعت اور آئین جہاں بانی و جہانداری علیحدہ علیحدہ تھے۔ چونکہ شریعت کے قوانین ہمیشہ کے لئے نافذ کر دیئے گئے تھے اور اجتہاد کے دروازے بند ہو چکے تھے اس لئے بدلتے ہوئے حالات میں حکومتوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے "ضوابط" "آئین" اور تورہ تشکیل دیئے تاکہ حالات کے تقاضوں کے تحت ان کی مدد سے حکومت کریں۔ (۱۰)

اس لئے باغیوں کو سزا دیتے وقت وہ شریعت اور دین کے اصولوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور جن امراء سے انہیں ڈر ہوتا تھا کہ وہ ان کے اقتدار کے مخالف ہیں، انہیں اعلانیہ قتل کرنے کی بجائے. خفیہ طور پر زہر دے کر یا دوسرے طریقوں سے مار ڈالتے تھے۔ (۱۱)

علاؤالدین کے زمانہ میں جب نو مسلموں نے بغاوت کی. تو ان کے جرم کی سزا میں ان کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا گیا، برنی اس سلسلہ میں لکھتا ہے: "مردوں کے جرم کی پاداش میں ان کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرنے کا رواج اسی تاریخ سے شروع ہوا ہے اس سے پہلے دہلی میں مردوں کے جرم کی وجہ سے ان کے عورتوں اور بچوں پر ہاتھ نہیں ڈالتے تھے" (۱۲) علاؤالدین کے ایک امیر نصرت خان نے "ان لوگوں کی بیویوں کو جنہوں نے اس کے بھائی پر تیر چلائے تھے. رسوا اور ذلیل کیا اور ان بیچاریوں کو بھنگیوں کے قبضے میں دے دیا کہ وہ ان کی آبروریزی کریں. اور ان کے بچوں کے لئے حکم دیا کہ ان کی ماؤں کے سامنے ان کو چیر کر پھینک دیں" (۱۳)

سلطان کے جاسوس سلطنت کے ہر کونے میں ہوا کرتے تھے، اور ان کی رپورٹوں پر لوگوں کو گرفتار کیا جاتا تھا، بعض اوقات ان کی جھوٹی رپورٹوں پر خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے تھے۔ (۱۴)

—۱۰—

حکمران کا تعلق براہ راست عوام سے نہیں ہوتا تھا. اس کی شخصیت عام آدمی کی پہنچ سے دور ہوتی تھی۔ اس لئے حکمران اور رعیت کے درمیان رابطہ کا کام امراء کرتے تھے۔ یہ امراء وزیر، مقطاع، صوبیدار اور عہدے دار ہوا کرتے تھے۔ انہیں عہدوں کے ساتھ ساتھ جاگیریں دی جاتی تھیں اور ان کی ذمہ داری یہ ہوتی تھی کہ حکومت کو پابندی سے مالیہ ادا کریں اور ضرورت کے وقت اسے فوج مہیا کریں۔ ان کی یہ جاگیریں موروثی نہیں ہوا کرتی تھیں اور ان کے تبادلہ وقتاً فوقتاً ہوا کرتے تھے تا کہ یہ کسی ایک علاقہ میں اپنا اثر ورسوخ پیدا نہ کرلیں۔

سلاطین کے عہد میں صرف ترکوں. اور بعد میں افغانوں کو اعلیٰ عہدے ملتے تھے۔ مغلوں کے عہد میں وسط ایشیا اور افغانستان سے آنے والے اعلیٰ منصبوں پر فائز ہوتے تھے۔ بعد میں راجپوتوں کے اعلیٰ گھرانوں کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا. ورنہ ہندوؤں کو نچلے درجے کی ملازمتیں ملا کرتی تھیں۔ اس لئے حکومت کے عہدوں پر اکثریت غیر ملکیوں کی ہوا کرتی تھی۔ مورلینڈ کے مطابق اکبر کے زمانہ میں ۷۰ فیصد منصب دار ان خاندانوں سے تھے جو ہمایوں اور اکبر کے زمانہ میں باہر سے آئے تھے۔ ۳۰ فیصد میں سے آدھے ہندوستانی مسلمان تھے اور آدھے ہندو۔ (۱۵)

ان منصب داروں کی تنخواہیں بہت زیادہ ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً شاہ جہاں کے زمانہ میں ہفت ہزاری منصب دار کی تنخواہ تیس لاکھ روپیہ سالانہ ہوا کرتی تھی۔ اس لئے یہ منصب دار حکومت کے انتہائی اہم ستون بن گئے۔ اور ان کی حکومت سے وفاداری کی جڑیں انتہائی گہری ہو گئیں۔

کثیر آمدنی کی وجہ سے یہ اپنی ذات پر بے تحاشہ پیشہ خرچ کرتے تھے. غلاموں اور خادموں کی ایک بڑی تعداد ان کے ہر اشارے پر ان کی خدمت کے لئے تیار رہتی تھی۔ یہ دعوتوں. تقریبوں اور تہواروں پر دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔ غریبوں کے لئے لنگر خانے اور خیرات و صدقات کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ اس وجہ سے ان سے خوشامدیوں اور نکموں کی ایک فوج وابستہ ہوتی تھی جو ہر وقت ان کی تعریف و توصیف کرتی رہتی. اور ان کی داد و دہش پر ان کا گذارہ ہوتا تھا ان کے حرم میں چار بیویوں کے علاوہ کنیزوں کی ایک بڑی تعداد ہوتی تھی. جو یا تو بر آمد کی جاتی تھیں یا جنگ میں پکڑ کر لائی جاتی تھیں. ان سے جنسی تعلقات رکھنا مذہبی نقطہ نظر سے جائز تھا اس وجہ سے ان کی اولاد کی تعداد بھی زیادہ ہوتی تھی۔

یہ امراء دربار کی ثقافت کی پیروی کرتے ہوئے خود بھی اپنی محفلوں میں انہیں ادب و آداب کی پابندی کرتے تھے اور ان کی مجلسیں بادشاہ کے دربار کا نمونہ ہوا کرتی تھیں۔

سماجی اور نسلی طور پر یہ امراء خود کو عام لوگوں سے برتر اور افضل سمجھتے تھے اور ان سے کسی قسم کے سماجی یا ثقافتی تعلقات نہیں رکھتے تھے. شادی بیاہ. اور ملنے ملانے میں سماجی رتبہ کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔

اس طرح سے جو سیاسی اور معاشی ڈھانچہ تیار ہوا تھا، اس میں بادشاہ اور امراء نے مل کر حکمرانی طبقہ تشکیل دیا تھا. جو سیاسی اور معاشی طور پر دوسرے طبقوں سے ذرا طاقتور اور مضبوط تھے۔

حوالہ جات

۱- ص- Bayly. C.A: Rulers, Townsmen and Bazaar. Cambridge 1983, ۴۶۱

۲- ایضاً ص- ۱۹۲

۳- ایضاً ص- ۵۶

۴- غلام مصطفٰے خاں (مرتب) لوائح خانقاہ مظہریہ۔ بحوالہ مقالات مظہری لاہور ۱۹۸۳ء ص- ۲۴

۵- مناظر احسن گیلانی: تفہیمات السبیہ۔ الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر) بحوالہ مقالات مظہری: ص- ۱۴۶

۶- شیخ محمد اکرام: رود کوثر. لاہور ۱۹۸۲ء ص- ۵۴۷

۷۔ خلیق احمد نظامی: سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، دہلی ۱۹۸۱ء ص۔ ۲۲

۸۔ ضیاء الدین برنی: ص۔ ۳۷۲

۹۔ ایضاً: ص۔ ۴۰۴ــ۴۰۵

۱۰۔ پروفیسر محمد حبیب: تعارف۔ ص۔ VI (خلیق احمد نظامی)

۱۱۔ برنی: ۱۰۴ــ۱۰۵

۱۲۔ ایضاً: ۳۷۹

۱۳۔ ایضاً: ۳۷۹

۱۴۔ ایضاً: ۷۸۱

۱۵۔ مورلینڈ۔ ڈبلیو۔ ایچ: INDIA at the Death of Akbar. London, 1920. pp. ۷۰ــ۷۹

مسلمان معاشرہ

ہندوستان میں اسلام تین علاقوں میں مختلف شکلوں میں آیا۔ جنوبی ہندوستان میں عرب تاجر آئے جنھوں نے اس علاقہ میں اسلام کو روشناس کرایا مگر ان کے ذریعہ اسلام اس لئے زیادہ نہیں پھیل سکا کہ ان کے پاس کوئی سیاسی طاقت نہیں تھی۔ ان کے ذاتی اثر و رسوخ سے بہت کم تعداد مسلمان ہوئی۔ سندھ میں اسلام عرب فاتحین کے ساتھ آیا، چونکہ یہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا اور اسلام میں ابھی تک فقہی مسلک پیدا نہیں ہوئے تھے اس لئے اس میں سختی و شدت نہیں تھی۔

عربوں کے بعد سندھ اور پنجاب میں اسماعیلی مشنریوں نے تبلیغ کا کام شروع کیا وہ سنی اکثریتی علاقوں میں رہتے ہوئے بحیثیت مذہبی اقلیت خفیہ، خاموش اور موثر کام کرنے میں ماہر ہو گئے تھے اور انسانی نفسیات سے بخوبی واقف ہوتے ہوئے یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ آبائی مذہب کے اثرات سے ایک دم انسان کو نہیں چھڑایا جا سکتا ہے۔ اس لئے انہوں نے اسماعیلی مذہب کو ہندوستان میں ہندو مذہب کی شکل میں روشناس کرایا اور اپنے نام بھی ہندو رکھ لئے تاکہ ہندو معاشرہ میں ان کے خلاف اچانک کوئی رد عمل نہ ہو۔ پہلے مرحلہ میں وہ ان کی ثقافتی زندگی میں دخل نہیں دیتے تھے، دوسرے مرحلہ میں جاکر وہ انہیں اسماعیلی مذہب کی تعلیمات سے آگاہ کرتے تھے، اس طرح انہوں نے آہستہ آہستہ لوگوں کا مذہب تبدیل کیا اور بالآخر اس پوزیشن میں ہو گئے کہ اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔

تیسرے مرحلہ میں اسلام ترکوں کے ذریعہ ہندوستان میں آیا، لیکن ترک جو اسلام لے کر آئے وہ عربوں سے مختلف تھا، کیونکہ اس وقت تک اسلام میں مختلف فرقے اور فقہی

مسلک پیدا ہو چکے تھے۔ وسط ایشیا اور ایران میں انہوں نے مسلمان ہونے کے باوجود عربی کلچر کے خلاف زبردست رد عمل کا مظاہرہ کیا. اور شعوبیہ۔ (قومیت) کی تحریک کے زیر اثر اپنی قدیم روایات اور اقدار کو نہ صرف زندہ رکھا. بلکہ انہیں اسلام میں شامل کر کے، اس کا ایک حصہ بنا دیا. اور عربوں کے مقابلہ میں اپنی انفرادیت کو باقی رکھا۔ قدیم ایرانی دربار کی رسومات و آداب. ایرانی قصے کہانیاں. فارسی زبان اور ایرانی نام، یہ تمام کے تمام برقرار رہے اور اسلامی تہذیب کا حصہ بن گئے۔

وسط ایشیا کے لوگ حنفی مسلک کے حامی تھے اور اس میں ان کا رویہ بڑا سخت اور تشدد کا تھا۔ اس لئے ترک حکمران اور ان کے ساتھ آنے والے علماء مذہب کے بارے میں انتہاپسند رویہ رکھتے تھے. اسماعیلی مشنریوں کی طرح ان میں رواداری اور ذہنی آزادی نہیں تھی۔ حکومت کی سرپرستی اور سیاسی اقتدار میں شرکت کی وجہ سے بھی ان کا رویہ سخت ہو گیا تھا۔ اس لئے ابتدا ہی سے وہ ہندو مذہب. اس کی روایات اور اقدار کے خلاف تھے۔ اور ہندوؤں کو کافر و مشرک سمجھ کر واجب القتل گردانتے تھے۔ اس مسلک کے علاوہ وہ مسلمانوں کے دوسرے فرقوں کے بھی خلاف تھے اور انہیں بھی مرتد سمجھ کر ان کا خاتمہ چاہتے تھے۔

محمود غزنوی نے انہیں مذہبی اثرات کے تحت ملتان کی اسماعیلی حکومت سے جنگیں لڑیں اور ان کی سیاسی طاقت کو ختم کر دیا۔ بعد میں پنجاب میں جب غوری سلطنت قائم ہوئی تو سنی علماء نے پھر اس بات کی کوشش کی کہ ملتان اور سندھ سے اسماعیلیوں کے اثرات کو ختم کیا جائے۔ گجرات میں جہاں بعد میں اسماعیلیوں نے پناہ حاصل کر لی تھی وہاں بھی سنی علماء کے اثر و رسوخ کی وجہ سے سلطان محمود بیگڑا اور سلطان مظفر اول کے زمانہ میں یہ گمنامی میں چلے گئے۔

شیعہ مسلک کو ایران میں صفویوں کے بعد فروغ ہوا. اور ان کی سرپرستی میں ایران کی اکثریت شیعہ ہو گئی. ہندوستان میں ان کی آمد مغلوں کے زمانہ سے شروع ہوئی خاص طور سے ہمایوں کی ایران سے واپسی کے بعد، جہاں گیر کے زمانہ میں نور جہاں کا خاندان سیاسی

طور پر انتہائی طاقت ور ہو گیا اور شیعہ امراء کو دربار میں اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس لئے دربار میں سنی و شیعہ امراء کے اختلافات پیدا ہو گئے۔

سنی فرقہ چونکہ سیاسی طور پر اقتدار میں تھا اور آبادی کی اکثریت بھی ان کے مسلک سے تھی اس لئے یہ کسی بھی تبدیلی کے مخالف رہے. جب کہ شیعہ اور دوسرے اقلیتی فرقے اکثریت کے ہاتھوں سختی کی وجہ سے بغاوت کا عنصر رکھتے تھے اور ان عناصر کا ساتھ دیتے تھے جو سنی اقتدار کو ختم کر کے تبدیلی لانا چاہتے تھے۔

— ا —

ہندوستان کے مسلمان معاشرے میں کتنے لوگ تھے جو دوسرے ملکوں سے ہجرت کر کے یہاں آئے اور یہاں مستقل رہائش اختیار کر لی اور کتنے ہی مقامی لوگ تھے جو مسلمان ہوئے اور ان کا ہندوؤں کی کن کن ذاتوں سے تعلق تھا؟ اس کے بعد یہ سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں کیا اسلام کی اشاعت میں مسلمان حکمرانوں نے دلچسپی لی. یا یہ کام علماء اور صوفیاء نے انجام دیا؟ یہ تمام سوالات انتہائی اہم ہیں اور ان کا مکمل جواب اس لئے نہیں دیا جا سکتا کہ ہمارے پاس مواد کی کمی ہے جو اس بارے میں معلومات فراہم کرے۔

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت اس وقت اہمیت اختیار کر گئی جب یہاں پر مسلمان حکمران طبقوں نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکمرانوں کو اس سے تو دلچسپی تھی کہ مقامی لوگ مسلمان ہوں تا کہ ان کی سیاسی قوت میں اس سے اضافہ ہو۔ لیکن ساتھ ہی وہ جبر اور تشدد سے لوگوں کو مسلمان نہیں کرنا چاہتے تھے کہ کہیں رد عمل کے طور پر ان کے خلاف بغاوتیں نہ ہو جائیں۔ دوسرے ان کی خواہش تھی کہ ہندوؤں کے صرف ان طبقوں کو مسلمان کیا جائے جو سیاسی لحاظ سے مضبوط ہوں، کیونکہ اس صورت میں ان کی حکومت کی بنیادیں مستحکم ہوتیں۔ جہاں تک عام رعایا کا تعلق ہے انہوں نے کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔

علماء کے سلسلہ میں ہم عصر تاریخوں سے اس قسم کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ انہوں

نے باقاعدہ تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھی ہوں۔ یہ وقتاً فوقتاً حکومت پر ضرور زور دیتے تھے کہ کافروں پر سختی کی جائے اور انہیں ذلیل و خوار کیا جائے. مگر انہوں نے باقاعدہ اشاعت اسلام کے لئے کچھ نہیں کیا۔ کیونکہ ہندوستانی معاشرہ میں ذات پات کی تقسیم کی وجہ سے نچلی ذات کے لوگ غربت و افلاس اور جہالت میں گندی و غلیظ زندگی گزارتے تھے اور معاشرہ میں ان کا بحیثیت انسان کوئی مقام نہیں تھا اس لئے مسلمان حکمران طبقوں نے انہیں اسی حالت میں رہنے دیا اور ان سے کوئی سماجی تعلق قائم نہیں کیا۔

ہمارے ہاں صوفیا کے بارے میں بھی یہ غلط فہمی ہے کہ اسلام کی اشاعت ان کی وجہ سے ہوئی۔ اس غلط اور گمراہ کن مفروضہ کی وجہ ان کے عقیدت مند ہیں جنہوں نے ان کے کارناموں کو مبالغہ کے ساتھ بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے. ورنہ ان صوفیاء نے بھی اسلام کی اشاعت میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ مثلاً سلاطین دہلی کے ابتدائی دور میں معین الدین چشتی اجمیر میں اور قطب الدین بختیار کاکی سے لے کر نظام الدین اولیاء تک یہ بڑے بڑے صوفی جن علاقوں میں مقیم رہے ان میں کبھی بھی مسلمانوں کی آبادی اکثریت میں نہیں رہی. ورنہ اس مفروضے کے تحت تو یہ سارے علاقے مسلمان ہونے چاہئیں تھے۔ اس قسم کی کوئی مصدقہ تاریخی معلومات بھی نہیں ہے کہ انہوں نے ہندوؤں کو مسلمان بنانے کے لئے تبلیغ کی ہو۔ مثلاً نظام الدین. اولیاء کے سلسلے میں یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ان کے ہاتھوں صرف ایک شخص مسلمان ہوا۔ (۱)

ہندوستان میں اسلام سیاسی حکومت کے قائم ہونے کے بعد پھیلا. لوگ اس لئے مسلمان ہوئے کہ اپنی جاگیریں اور مراعات کو محفوظ کر لیں. یا اس لئے کہ انہیں حکومت کی ملازمتیں مل جائیں. ذات برادری سے اخراج بھی تبدیلی مذہب کی ایک وجہ تھی۔ نچلی ذات کے لوگ اس امید میں مسلمان ہوئے کہ شاید نئے معاشرہ میں انہیں سماجی طور پر عزت مل جائے اور کچھ لوگ اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر بھی مسلمان ہوئے یہ بھی دستور تھا کہ اگر سیاسی قیدی مذہب بدل لیتے تھے تو انہیں معافی دے دی جاتی تھی، اس لئے مقامی آبادی آہستہ آہستہ کافی تعداد میں مسلمان ہوئی۔

— ۲ —

ہندوستان کی فتح کے بعد اور اپنی حکومت کے قیام کے بعد حکمران طبقوں کی رائے ہندوؤں کے بارے میں کوئی اچھی نہیں تھی۔ فتح کے بعد احساس برتری نے انہیں اس بات کا موقع نہیں دیا کہ وہ ہندوؤں کی تاریخ. ثقافت. یا ان کے مذہب کے بارے میں ٹھوس معلومات حاصل کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ہندو سماج کو اپنی روایات اور اقدار کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا. اس صورت میں انہیں بت پرستی. لنگ کی پوجا. رقص و موسیقی، مذہبی جلوس، بھجن، تہواروں کی رنگینی. اور مندروں میں جنسی تعلقات کی تصویریں اخلاق سے گری ہوئی نظر آئیں۔ جنہیں ان کا ذہن قبول کرنے پر تیار نہیں ہوا۔ انہوں نے ہندو مذہب کے ارتقاء اور ان کے رسم و رواج کی ابتدا کے بارے میں منطقی طور پر نہیں سوچا. اس لئے ہندو رسومات مثلاً ستی. گنگا کی پوجا اور تیرتھوں کی زیارت نے انہیں ہندوؤں سے مزید برگشتہ کر دیا۔ چونکہ یہ ان کی مذہبی کتابوں. دیومالائی قصوں اور دیوی دیوتاؤں سے ناواقف تھے. اس لئے ان کے بارے میں یہ تصور قائم ہوا کہ ہندوؤں کے ہاں کوئی پیغمبر نہیں آیا. اور خدا نے اس قوم کی کوئی اصلاح نہیں کی اس لئے یہ گمراہ لوگ ہیں۔ اس لئے ہندوؤں کی بت پرستی کو اسلام سے قبل جاہلیت کے زمانہ سے تعبیر کیا گیا اور دونوں معاشروں میں ایک ہی قسم کی اخلاقی برائیاں ڈھونڈی گئیں۔ اس لئے حکمرانوں میں یہ جذبہ پیدا کیا گیا بتوں کو توڑ کر اور مندروں کو مسمار کر کے ہندوؤں کی اخلاقی حالت اس طرح سدھاریں جیسے ابتدائی دور میں مسلمانوں نے کیا تھا۔

وسط ایشیا میں منگولوں کے حملوں کے نتیجہ میں علماء کی ایک بڑی تعداد ہجرت کر کے ہندوستان میں آئی. یہ سنی العقیدہ اور فقہی معاملات میں انتہا پسند تھے. انہوں نے یہاں آکر سلاطین دہلی کو اس بات پر مجبور کیا کہ ہندوؤں کے ساتھ بطور ذمی برتاؤ نہیں کریں کیونکہ یہ صرف اہل کتاب کے لئے جائز ہے۔ ہندو چونکہ اہل کتاب نہیں لہذا انہیں یا قتل کیا جائے یا مسلمان بنایا جائے اور اگر یہ نہیں ہو سکے تو کم از کم انہیں ذلیل و خوار حالت میں رکھا

جائے۔

سید نورالدین مبارک غزنوی (وفات ۱۲۳۴) نے بادشاہوں کے فرائض بیان کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ کفار اور مشرکین کا ان کی کثرت کی وجہ سے خاتمہ نہیں کر سکیں تو ان کو ذلیل و خوار رکھیں اور انہیں عزت کی زندگی نہ بسر کرنے دیں (۲) بلبن نے اپنے لڑکے خان شہید کو جو نصیحت کی اس میں کہا کہ بادشاہ کا کام ہے کہ کفر اور کافروں کو، شرک اور بت پرستی کو ختم کر دے، اگر یہ نہ کر سکے تو انہیں ذلیل و خوار رکھے (۳) جلال الدین خلجی کو اس بات پر افسوس تھا کہ ہر روز ہندو ڈھول اور باجے بجاتے ہوئے جمنا کے کنارے اپنی مذہبی عبادت کو جاتے ہیں، وہ کہا کرتا تھا کہ: "اگر میں بادشاہ اسلام ہوتا...... ایک کو بھی اجازت نہ دیتا کہ پان بیڑہ اطمینان خاطر کے ساتھ کھائے یا سفید کپڑے پہنے یا مسلمانوں کے سامنے منہ سے جھاگ اڑائے" (۴) علاؤالدین خلجی کے زمانہ میں ایک عالم شمس الدین ترک حدیث کی چار سو کتابیں لے کر ہندوستان میں آئے، اور ملتان سے سلطان کو لکھا کہ:

> "میں نے سنا ہے کہ ہندوؤں کی عورتیں اور بچے مسلمانوں کے دروازوں پر بھیک مانگتے ہیں۔ اے بادشاہ اسلام تجھ پر آفرین کہ تو دین محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ایسی دین پناہی کرتا ہے۔" (۵)

علماء اس بات پر متفق تھے کہ ہندوؤں کو کمزور رکھا جائے، اس سلسلہ میں قاضی مغیث، جو علاؤالدین خلجی کے عہد کے ایک مشہور عالم تھے، ان کا کہنا تھا کہ ہندو اس وقت تک مسلمانوں کے فرماں بردار نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ مفلس اور غریب نہ ہو جائیں۔ (۶) چنانچہ مسلمان حکمرانوں نے ہندوؤں کے ساتھ اس پالیسی کو اختیار رکھا کہ انہیں اپنے مفتوح ہونے کا برابر احساس رہے۔ جزیہ کا نفاذ اگرچہ عملی طور پر باقاعدگی کے ساتھ نہیں رہا، مگر ذمی ہونے کا احساس ہی دوسرے درجہ کے شہری ہونے کا تھا، اور جب بھی جزیہ لیا گیا تو اسے محض ٹیکس کے طور پر نافذ نہیں کیا گیا، کیونکہ بحیثیت ٹیکس یہ زیادہ رقم نہیں ہوتی تھی، مگر اس کا مقصد ہندوؤں کو ذلیل کرنا تھا اور ذمی کے لئے ضروری تھا کہ وہ رقم

ذاتی طور پر آکر جمع کرائے۔ احمد سرہندی نے اس سلسلہ میں ایک خط میں لکھا ہے کہ: "یہ جو کفار پر جزیہ وغیرہ لگایا جاتا ہے تو اس سے ان کی محض رسوائی اور تذلیل مقصود ہوتی ہے" (۷)

مسلمان حکمرانوں کے اس پورے دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں مساوی تعلقات قائم نہیں ہو سکے۔ مثلاً ہندو کسی مسلمان عورت سے شادی نہیں کر سکتا تھا. ہندو مسلمانوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کر سکتا تھا. پرانے مندر مرمت نہیں کرا سکتا تھا, اور نئے مندر بنانے کی اجازت نہیں تھی. ہندوؤں کو اپنے تہوار اس طرح منانے کی اجازت تھی کہ مسلمان ان سے متاثر نہ ہوں. ان کی تیرتھ اور زیارت گاہوں پر ٹیکس لگائے گئے تھے (۸) اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کو آزادی تھی کہ وہ ہندو عورت سے شادی کریں تبلیغ کے ذریعہ ان کے مذہب کو تبدیل کریں۔ اور جن علاقوں میں چاہیں آزادی سے مسجدیں تعمیر کریں اور اپنے تہوار شان و شوکت سے منائیں۔

اس فرق کی وجہ سے دونوں مذہبوں کے ماننے والوں میں فاصلہ قائم رہا. ورنہ اس سے پہلے ہندو مذہب ہر آنے والے کو اپنے اندر جذب کرتا رہا تھا۔ مسلمان اس لئے اس میں ضم نہیں ہو سکے کہ انہوں نے یہاں آباد ہونے کے باوجود اپنا تعلق وسط ایشیا ایران اور عرب ملکوں سے برقرار رکھا اور وہاں کی مذہبی تحریکوں اور مذہبی خیالات و افکار سے متاثر ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ مذہب فاتح اور مفتوح کے درمیان فرق قائم کئے ہوئے تھا اور حکمران طبقے اس فرق کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ تاکہ غیر مسلم ہونے کی حیثیت سے ان پر حکومت کی جا سکے اور نچلی ذات کے لوگوں سے نچلے درجہ کے کام کرائے جا سکیں۔

— ۳ —

ہندوستان کے مسلمان معاشرے کو ہم دو طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں اول تو وہ لوگ. جو بحیثیت فاتحین کے یہاں آئے اور حکومت قائم ہونے کے بعد مسلسل وسط ایشیا. ایران. افغانستان اور عرب ملکوں سے ہجرت کر کے تلاش معاش اور بہتر موقع کی تلاش میں

یہاں آتے رہے۔ دوسرے طبقے میں وہ لوگ تھے جو مقامی تھے اور مختلف وجوہات کی بنا پر مسلمان ہو کر مسلمان معاشرے کا ایک حصہ بن گئے تھے. اس وجہ سے مسلمان معاشرہ غیر ملکی اور مقامی مسلمانوں میں بٹ گیا۔ لیکن غیر ملکی اور مقامی کا یہ تصور وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا۔ کیونکہ ابتدائی دور میں آنے والے مسلمانوں نے ایک طویل عرصہ ہندوستان میں رہنے کے بعد یہاں کی عادات و اطوار اختیار کر لی تھیں اور خود کو ہندوستان کے ماحول میں ضم کر لیا تھا. اگرچہ ان میں غیر ملکی اور مقامی کا فرق ضرور تھا۔ جب مغلوں نے ہندوستان پر حملہ کیا اور اپنا اقتدار قائم کیا تو عہد سلاطین کے مسلمان حکمران طبقوں نے انہیں غیر ملکی تصور کیا اور اس بنیاد پر راجپوتوں کے ساتھ مل کر ان کے خلاف جنگیں لڑیں۔ جنگ کنواہہ میں میواتی و افغان سردار معہ اپنی فوجوں کے مغلوں کے خلاف لڑے۔ یہاں تک کہ ہلدی گھاٹ تک کی جنگ میں جو اکبر اور راجپوتوں کے درمیان ہوئی. اس میں افغان. راجپوتوں کے ساتھ تھے۔

اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے مغلوں نے اپنے اقتدار میں افغانوں اور دوسرے مقامی مسلمانوں کو شریک نہیں کیا۔ چونکہ دہلی کی سلطنت انہوں نے ہندوؤں سے نہیں افغانوں سے جنگ کے بعد حاصل کی تھی. اس لئے انہیں شکست خوردہ ہونے کی حیثیت سے اپنے سے کمتر سمجھا اور ان کا ذکر حقارت سے کیا. اور اس بات پر ان کا مذاق اڑایا کہ وہ عادات کے اعتبار سے ہندوستانی ہو گئے۔ چنانچہ پورے مغل دور میں ملکی اور غیر ملکی کا فرق قائم رہا۔ چونکہ ماوراءالنہر. ایران اور افغانستان کے لوگ مسلسل ہجرت کر کے آتے رہتے تھے. اس لئے وہ یہاں کے مسلمانوں پر طنز کرتے تھے کہ وہ اپنی شناخت ختم کر کے ہندوستانی بن گئے۔ اس لئے ہر آنے والا نووارد خود کو ثقافتی طور پر ان سے برتر سمجھتا تھا۔ مثلاً ہندوستان میں حکمرانوں کی زبان فارسی تھی جس میں بہت سے سنسکرت اور ہندی کے الفاظ مل گئے تھے اور ہندوستان کی فارسی ایران سے مختلف ہو گئی تھی. اس فرق کی وجہ سے زبان کے معاملہ میں ہندوستانی خود کو ہمیشہ کمتر سمجھتے تھے۔

اگر ایک فرد ہجرت کر کے کسی دوسرے علاقے میں جاتا ہے تو اس کے لئے یہ

آسان ہوتا ہے کہ وہ خود کو نئے معاشرے میں ضم کرے کیونکہ انفرادی حیثیت سے وہ نئی ثقافتی قوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے لیکن اگر ہجرت کر کے آنے والوں کی تعداد زیادہ ہو تو اس صورت میں نئی جگہ پر اپنی ثقافت کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر نئے علاقہ میں اقتصادی ذرائع محدود ہوں تو پھر مقامی اور غیر ملکی افراد میں تصادم و کش مکش شروع ہو جاتی ہے۔ مقامی آبادی نوواردوں کو اس لئے اپنا دشمن سمجھتی ہے کہ ان کی زرخیز زمینوں، کھیتوں، مویشیوں، جنگلات اور معدنیات پر جن پر اب تک ان کا قبضہ تھا اب غیر ملکی بزور طاقت اس میں حصہ دار بن گئے۔

نوواردوں اور غیر ملکیوں میں دوسرا تصادم تہذیب و ثقافت کا ہوتا ہے۔ نووارد اپنے ساتھ اپنے وطن سے اپنی تمام یادیں ساتھ لاتے ہیں۔ ان کے تہوار اور ان کی ثقافتی و سماجی روایات ان کے ساتھ سفر کرتی ہیں۔ اس لئے نئی سرزمین میں وہ اپنی ثقافت ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابتدا میں یہ ثقافتی تصادم بڑا سخت ہوتا ہے۔ مگر پھر آہستہ آہستہ دونوں معاشرے ایک دوسرے کی ثقافتی روایات اختیار کر لیتے ہیں اور اس ملاپ سے ایک جاندار تہذیب ابھرتی ہے۔ جیسے ہندوستان میں آریاؤں کے اشتراک کے نتیجہ میں ہوا۔ لیکن اگرچہ دونوں ثقافتوں میں اشتراک ہو اور کسی ایک ثقافت کے پیرو کار خود کو برتر سمجھتے ہوئے علیحدگی پر زور دیں اور ان تمام علامتوں اور نشانیوں کو مٹانا چاہیں جو ملاپ کی جانب لے جاتی ہیں تو اس صورت میں دونوں معاشروں میں ثقافتی تصادم ہمیشہ کے لئے قائم ہو جاتا ہے۔ اس تصادم کے نتیجہ میں نسلیں قربانیاں دیتی ہیں۔ مگر اس قربانی کے نتیجہ میں نہ تو تخلیقی کام ہوتے ہیں اور نہ جمود ٹوٹتا ہے بلکہ تعصب اور تنگ نظری کے جذبات تہذیبی و ثقافتی ترقی کو روک دیتے ہیں۔

— ۴ —

ہندوستان میں جو مقامی مسلمان ہوئے انہوں نے اپنا مذہب تو بدل لیا مگر وہ اپنا ثقافتی روایات اور اقدار کو نہیں بدل سکے اور ان میں ہندوانہ رسومات اور غیر ملکی مسلمانوں کے

طریق کار دونوں شامل ہو گئے۔ چونکہ ہندوستان میں اکثریت مسلمان نہیں ہوئی اور سیاسی طاقت غیر ملکی مسلمانوں کے پاس رہی اس لئے یہ اپنی ثقافت کو ایرانیوں اور ترکوں کی طرح اسلام کا ایک حصہ نہیں بنا سکے۔ اور ثقافتی طور پر خود کو غیر ملکیوں سے کم تر سمجھنے لگے۔ علماء نے ہمیشہ ان کی ہندوانہ رسومات پر اعتراضات کئے اور انہیں غیر اسلامی کہا اور ان رسومات کی وجہ سے انہیں خالص اور برابر کا مسلمان بھی نہیں سمجھا اور یہ کہا گیا کہ وہ آدھے مسلمان ہیں۔ یہ مسلمان تو ہیں مگر ان کا مذہب خراب ہے اور ہندو رسومات کی وجہ سے وہ خالص اور اصلی نہیں ہیں۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ نچلی ذات کے لوگوں نے اپنا سماجی رتبہ بڑھانے کے لئے اسلام قبول کر لیا اس وجہ سے جو لوگ مسلمان ہوئے وہ خود کو نچلی ذات کا نہیں مانتے تھے اور ان کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ تمام مقامی روایات اور اقدار سے چھٹکارا پا کر خود کو غیر ملکی مسلمان طبقے میں ضم کر لیں اور اپنی شناخت مکمل طور پر تبدیل کر کے غیر ملکی مسلمانوں کی ذات پات اور قبائلی ناموں کو اختیار کر لیں۔ چنانچہ تمام ہندوستان میں کہا جاتا ہے کہ تمام قصائی قریشی۔ جولاہے انصاری۔ یا "رحمت الٰہی" بن گئے۔ ویسے ہندوؤں نے مسلمان ہونے کے بعد اپنے نام کے ساتھ لفظ "شیخ" کا اضافہ کر لیا۔ اکثر ہندوؤں کی ذاتوں نے اپنے سماجی مرتبہ کے لحاظ سے مسلمان ذاتوں کے نام اختیار کر لئے جیسے راجپوت "خان یا خانزادہ" بن گئے۔ نچلی ذاتوں کے لوگ جو یہ جرات نہیں کر سکتے تھے وہ مذہب بدلنے کے بعد "دیندار" یا "مسلی" کہلانے لگے۔

سندھ میں بھی اکثر مقامی سندھی قبائل نے مسلمان ہونے کے بعد اپنا شجرہ نسب عرب قبائل سے ملا کر اپنا سماجی درجہ بلند کیا۔ مثلاً "تھیم اور موریہ" خود کو آل تمیم اور آل مغیرہ سے تعلق بتاتے تھے اور خود کو عباسی۔ صدیقی۔ فاروقی اور عثمانی نژاد سمجھتے تھے۔ "پھنور" حضرت حارث ؓ کی اولاد بتاتے ہیں تو "منگی" بنو تمیم کی ایک شاخ ہیں۔ جٹ اور بلوچ محمد بن ہارون ؒ سے اپنا نسب ملاتے ہیں۔ سمہ خود کو عکرمہ بن ابی جہل کے خاندان سے ثابت کرتے ہیں۔ (۹) اور سومرو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ عباسیوں کے دارالخلافہ

سامرہ سے آئے ہیں اور اس نسبت سے سومرہ کہلاتے ہیں۔

سماجی اور ثقافتی طور پر خود کو بدلنے کے اس عمل میں ان کی جڑیں اپنی زمین اور ثقافت سے بھی کٹ گئیں تو دوسری طرف غیر ملکی مسلمانوں کے طبقے نے ان کی اس تبدیلی کا نہ صرف مذاق اڑایا بلکہ انہیں حقارت سے دیکھا اور کسی بھی مرحلہ پر انہیں سماجی لحاظ سے معاشرہ میں مساوی مقام نہیں دیا۔ ان غیر ملکی مسلمانوں نے جنہوں نے مقامی مسلمان عورتوں سے شادیاں کرلیں اور ان سے جو نسل پیدا ہوئی اسے بھی سماجی طور پر کمتر سمجھا گیا۔ مثلاً جنوبی ہند میں کونکن کے مقام پر آباد ہونے والے عرب نوائط کہلائے. یہ لوگ راس کماری کے مشرق میں آباد ہوئے۔ ان میں سے کچھ نے تامل عورتوں سے شادیاں کرلیں. ان سے جو مخلوط نسل پیدا ہوئی وہ "لبی" کہلائی۔ عرب نوائط ان لبیوں کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے (۱۰) کارومنڈل جسے عربی میں معبر کہتے ہیں یہاں جو عرب آباد ہوئے یہ مقامی مسلمانوں اور ان کی ہندو رسومات کو نفرت سے دیکھتے تھے۔ (۱۱)

سکندر لودی کی جانشینی کے وقت اس کی سب سے بڑی خرابی یہی تھی کہ اس کی ماں کا تعلق مقامی مسلمانوں کے خاندان سے تھا. اور افغان امراء ایک "سنار عورت" کے لڑکے کو تخت پر بیٹھا دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ سندھ میں مظفر خاں ترخان کو جس کی ماں سندھ کے قبیلہ جاریجہ سے تھی. اسے ترخانوی امراء نے بادشاہ نہیں بننے دیا اور اس کی مخالفت کی۔ مرزا باقی ترخان. جس کی ماں بھی مقامی تھی. اسے مذاق میں دربار میں امراء "سندھی بچہ" کہا کرتے تھے۔

برنی نے عہد سلاطین کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حسب و نسب اور اعلیٰ خاندان کے تصورات معاشرہ میں کس قدر گہرائی کے ساتھ سرایت کر چکے تھے۔ چونکہ حسب و نسب کی بنیادوں پر غیر ملکی خاندانوں کی نہ صرف اعلیٰ عہدوں پر اجارہ داری تھی. بلکہ انہیں ہر قسم کی مراعات بھی ملتی تھیں اس لئے وہ اس نظام کو اور اس طریقہ کو اسی طرح برقرار رکھنا چاہتے تھے اور اہلیت و قابلیت کو اس کے مقابلہ میں ختم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے نسل. ذات اور خاندان کی بنیادوں پر ابھرتے ہوئے اہل اور قابل لوگوں کو روکا

اور انہیں آگے نہیں بڑھنے دیا۔ مثلاً التمش کے عہد میں اس کے وزیر نظام الملک جنیدی نے قنوج کی خواجگی کے لئے جمال الدین مرزوق کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا تو دربار کے ایک امیر خواجہ عزیز نے فوراً یہ شعر پڑھا:

بہ دست دوں مدہ خامہ کہ گردوں رامجال افتد
سیہ سنگے کہ در کعبہ است ساز و سنگ استنجا

(کمین کے ہاتھ میں قلم مت دے۔ اس لئے کہ اگر کمین کو مجال ہو تو سیاہ پتھر کو جو کعبہ میں ہے، استنجے کا ڈھیلا بنا دے گا)

سلطان نے تفتیش کی تو پتہ چلا کہ واقعی کم اصل ہے۔ اگرچہ وزیر نے اس کی سفارش کی کہ اس کا خط بہت عمدہ ہے اور تحریر میں نہایت ہوشیار ہے۔ مگر سلطان نے ناراض ہوتے ہوئے کہا کہ کم اصلوں کی ہنرمندی کی وجہ سے اس کی حکومت بدنام ہوگی۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ اس کی حکومت سے کم اصل لوگوں کو جو اعلیٰ عہدوں پر ہیں نکال دیا جائے۔ تفتیش کے بعد ۳۲ آدمی نکلے۔ جنہیں برطرف کر دیا گیا (۱۲)

اس قسم کی پالیسی کو بلبن نے جاری رکھا۔ اس نے امروہہ کی خواجگی (اس عہدے کا تعلق حساب کتاب سے تھا) کمال میار کو اس لئے نہیں دی کہ اس کا باپ ہندو غلام تھا اس کے بارے میں کہا گیا کہ اگرچہ وہ ہنرمند اور پڑھا لکھا آدمی ہے مگر عالی نسب نہیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "میں کسی کمین یا نااہل کے لڑکے کو حکومت میں جو مجھ کو خدا کی طرف سے ملی ہے شریک نہیں کر سکتا" برنی اس بارے میں فخر سے لکھتا ہے کہ:

"اپنے سارے عہد خانی و بادشاہی میں جس کی مدت چالیس سال کی تھی۔ اس نے کسی رئیس (کم درجہ کے افسر بازار سے مراد ہے) بازاری (معمولی حیثیت کا سوداگر) مفرد (وہ سپاہی جس کا کسی امیر کے دستہ سے تعلق نہ ہو) کمینہ خصلت، کم ظرف، مطرب اور مسخرے سے بات نہیں کی"

(۱۳)

محمد تغلق نے اپنے عہد حکومت میں امراء کی طاقت کو توڑنے کی غرض سے مقامی

مسلمانوں کو اعلیٰ عہدے دے دیئے تھے جس کی وجہ سے اس کے خلاف زبردست ردعمل ہوا۔ ضیاء الدین برنی نے جو فہرست ان عہدیداروں کی دی ہے اور جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے اس وقت کے غیر ملکی مسلمان معاشرہ کے احساسات کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے:

"نجبا مطرب بچہ بداحل کو اس نے اتنا اونچا اٹھایا کہ اس کا مرتبہ بہت سے ملکوں سے بھی بڑھ گیا...... اسی طرح عزیز خمار اور اس کے بھائی کو فیروز حجام. منکا طباخ. مسعود خمار. لدھا باغبان اور بہت سے کمینوں کو اونچا اٹھایا اور عہدے و اقطاع انہیں عطا کیئے۔ شیخ بابو فلک بچہ جولاہے کو اپنا قرب عطا کیا ...... اور پیرا مالی کو جو ہندوستان کے سفلوں میں سفلہ ترین اور ذیلوں میں ذلیل ترین شخص تھا. دیوان وزارت دے دی...... احمد یاز کے غلام مقبل کو ...... گجرات کی وزارت دے دی" (۱۴)

مغلوں کے زمانہ میں بھی غیر ملکی اور مقامی مسلمانوں میں فرق رہا. اس فرق کو یورپ سے آنے والے سیاح برنیر نے بھی محسوس کیا اور لکھا کہ وسط ایشیا اور ایران سے آنے والوں کی رنگت صاف ہوتی ہے جب کہ مقامی مسلمانوں کی رنگت کالی اور سانولی ہوتی ہے اور یہ دونوں کے درمیان تفرق پیدا کرتی ہے۔ سفید رنگت والے خود کو برتر سمجھتے ہوئے کالی رنگت والوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اس لئے رنگت قائم رکھنے کی وجہ سے امراء کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ کشمیر کی عورتوں سے شادیاں کریں تاکہ ان کی گوری رنگت کی اولاد پیدا ہو۔ (۱۵)

غیر ملکی مسلمانوں نے اقتدار میں رہنے کی غرض سے دوسری قوموں کے بارے میں مختلف کہانیاں مشہور کر رکھی تھیں اور ان کی خصوصیات مقرر کر کے ان کے لئے انتظامیہ کے مختلف شعبہ مخصوص کر دیئے تھے. چونکہ ایرانیوں کی اکثریت انتظامیہ کے اعلیٰ عہدوں پر تھی اس لئے انہیں ہوشیار. زیرک. ذہین اور مہذب سمجھا جاتا تھا. ترک یا تورانی بہادر اور شجاع سمجھے جاتے تھے اور فوجی ملازمت کو یہ ترجیح دیتے تھے۔ عرب اور عثمانی ترک توپ خانہ

کی ملازمت کے لئے بہتر تصور کئے جاتے تھے. حبشی خواجہ سرا ہوا کرتے تھے. کشمیری نمک حرام کہلاتے تھے. افغانوں پر اعتماد نہیں کیا جاتا تھا (مغلوں کے زمانہ میں) اور نومسلموں کو اعلیٰ عہدے نہیں دیئے جاتے تھے۔ ان تصورات کا مقصد یہ تھا کہ ایرانیوں اور تورانیوں کا اقتدار پر قبضہ رہے اور دوسری اقوام اہلیت کے باوجود آگے نہ بڑھ سکیں۔

— ۵ —

ہندوستان میں مسلمانوں کا معاشرہ ذات پات میں تقسیم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا اور اشراف اور اجلاف کے خانوں میں بٹا ہوا تھا۔ اشراف میں جو ذاتیں تھیں ان کا تعلق ہندوستان سے باہر کے ملکوں سے تھا. ان میں مغل اپنے اقتدار کی وجہ سے اعلیٰ ذات میں شمار ہوتے تھے بعد میں یہ مرزا کے نام سے پکارے جانے لگے۔ (۱۶)

اہل سادات کا احترام ہندوستان کے مسلمان معاشرہ میں سب سے زیادہ ہوا کرتا تھا عزت کے طور پر انہیں شاہ کہا جاتا تھا اور اپنے حسب و نسب کی وجہ سے یہ اعلیٰ اور پاکیزہ سمجھے جاتے تھے اور ان سے کراماتیں منسوب ہو گئیں تھیں. ان کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ خدا نے انہیں مافوق الفطرت خصوصیات دی ہیں اس لئے ان کی دعا اور بد دعا میں اثر ہوتا ہے اور ان پر آگ بھی اثر نہیں کرتی۔ اس لئے ان کے تعویز. گنڈے اور دعائیں بیماروں کے لئے بطور علاج استعمال کی جاتی تھیں۔ حکمران بھی ان کی عزت کرتے تھے اور حکومت کے مذہبی و انتظامی عہدے انہیں دیئے جاتے تھے. اگر کوئی سید جرم کرتا تھا تو اسے معاف کر دیا جاتا تھا. اور اکثر حکمران ان کے قتل سے پرہیز کرتے تھے۔

ان مراعات کی وجہ سے سیدوں کے خاندانوں نے خود کو معاشرہ سے بالکل علیحدہ کر لیا تھا اور شادی بیاہ صرف اپنے خاندانوں میں کرتے تھے. تاکہ ان کا پھیلاؤ زیادہ نہ ہو۔ یہ شہروں میں علیحدہ محلوں میں رہا کرتے تھے. اور اپنے قبرستان بھی علیحدہ رکھتے تھے. تاکہ لوگ نذر نیاز دینے اور مرادیں مانگنے آئیں تو انہیں کے قبرستان میں اور مزاروں پر آئیں۔

سیدوں کے اس احترام اور مادی فوائد کا نتیجہ یہ ہوا کہ وسط ایشیا و ایران سے جوق در

جوق سیدوں کے خاندان ہندوستان میں آنے لگے. اور کونہ کونہ میں آباد ہو گئے۔ مثلاً سندھ میں صرف ٹھٹھہ شہر میں کلہوڑوں کے دور حکومت میں ۱۲ سیدوں کے بڑے بڑے خاندان آباد تھے. چھوٹے چھوٹے خاندان ان کے علاوہ تھے ان لوگوں کو حکومت میں قاضی. صدر. مفتی اور شیخ الاسلام کے عہدے ملا کرتے تھے. گذارے کے لئے حکومت جاگیریں دیتی تھی. ان میں اکثر پیری مریدی میں مصروف رہتے تھے جس کی وجہ سے لوگ تحفہ تحائف اور نذرانے لاتے تھے. اور اکثر کو کسان اپنی فصل کا چالیسواں حصہ دیا کرتے تھے۔ (۱۷)

چونکہ افغانوں نے ہندوستان میں حکومت کی. اور آخری عہد مغلیہ میں ان کی بڑی تعداد ہندوستان میں آئی. اس لئے انہوں نے بھی اپنی نسلی برتری کو سیاسی اقتدار اور جنگوں کے ذریعہ قائم کر لیا. اور اس برتری کو انہوں نے بھی اپنی ذات کے تحفظ میں برقرار رکھا۔

ذات پات کی وجہ سے ہندوستان میں کفو کا تصور پیدا ہوا. کہ کون سی ذات کس کے برابر ہے؟ خاص طور سے شادی بیاہ کے موقع پر اس کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا کہ کہیں نسل میں خرابی پیدا نہیں ہو جائے۔ اس وجہ سے ذات و برادری مسلمانوں کے لئے بھی انتہائی اہمیت اختیار کر گئیں اور کسی بھی شخص کے لئے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ اپنی ذات یا برادری کو چھوڑ سکے. کیونکہ کوئی دوسرا برادری والا اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے مسلمان معاشرہ میں مذہب سے زیادہ وفاداری کا مرکز ذات اور برادری ہو گئی۔

غیر ملکی مسلمان اپنی ذات کے تحفظ کے لئے. اور اپنی غیر ملکی شناخت کے لئے اپنے نام کے ساتھ اپنے آبائی شہروں کے نام لگاتے تھے. جیسے سمرقندی. شیرازی. اصفہانی. سبزواری اور بخاری۔ ان میں سے جو لوگ بخارا سے ہجرت کر کے برصغیر میں آئے وہ سب کے سب اہل سادات میں سے ہیں. اس لئے بخاری سید کا مترادف ہو گیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بخارا میں سوائے سیدوں کے اور کوئی بستا ہی نہیں تھا۔ چونکہ غیر ملکی مسلمان ہی

انتظامیہ اور فوج کے اعلیٰ عہدوں پر ہوا کرتے تھے اس لئے تمام اعلیٰ ثقافتی و اخلاقی خوبیوں کے مالک یہی ہوا کرتے تھے. جن میں شجاعت بہادری. فیاضی و سخاوت. اور رحمدلی و کرم گستری خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مقامی مسلمانوں کی اکثریت کاریگر. دستکار اور زراعت پیشہ ہوا کرتی تھی اور اکثر مسلمان ہونے کے بعد اپنے آبائی پیشہ کو جاری رکھتے تھے اس تفریق کی وجہ سے دونوں طبقوں میں زبردست سماجی و ثقافتی فرق پیدا ہو گیا تھا۔ وہ تمام پیشے جن میں محنت کی جاتی تھی اور ہاتھ سے کام کیا جاتا تھا. انہیں ذلیل و حقیر سمجھا جاتا تھا اور ان پیشوں کو اور ان میں مشغول رہنے والوں کو کمتر سماجی درجہ ملا ہوا تھا اس لئے طبقہ اعلیٰ کے افراد بھوکوں مرنا پسند کرتے تھے مگر کوئی پیشہ اختیار نہیں کرتے تھے کیونکہ اس سے ان کے خاندان کے وقار اور عظمت کو دھمکہ لگنے کا خطرہ تھا۔ آخری عہد مغلیہ میں ان اشراف کے بارے میں انشاء اللہ خاں انشاء نے کہا تھا.

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جسے دیکھو یہی کہتا ہے ہم بیکار بیٹھے ہیں!

مقامی آبادی کے جو لوگ مسلمان ہوئے انہیں غیر ملکی مسلمانوں نے کبھی بھی مساوی مقام نہیں دیا اور انہیں سماجی طور پر ہمیشہ پس ماندہ رکھا۔ بعض علاقوں میں تو اس قدر تعصب اور سختی برتی جاتی تھی کہ نچلی ذاتوں کے مسلمان کھانے پینے یا مجلسی آداب میں اشراف کی تقلید بھی نہیں کر سکتے تھے اور ہندو مذہب کے برہمن کی طرح اچھوتوں پر جو پابندیاں تھیں وہ ان پر بھی تھیں. مثلاً آخری دور تک سہارنپور میں یہ حالت تھی کہ وہاں کے امراء و اشراف کی جانب سے نچلے طبقوں کے مسلمانوں کے لئے یہ پابندیاں تھیں کہ وہ:

۱۔ وہ کھانا نہیں پکا سکتے جو کہ امراء کے ہاں خاص طور سے پکائے جاتے تھے جن میں پلاؤ. قورمہ وغیرہ شامل تھے

۲۔ انہیں اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ کسی بڑے آدمی کی دعوت کریں کیونکہ دعوت تو وہیں ہوتی ہے کہ جہاں دونوں کا درجہ سماجی طور پر ایک ہو۔ ایک نچلی ذات

کے مسلمان کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ ایک اعلیٰ ذات کے مسلمان کو گھر پر بلائے

۳۔ اپنے بچوں کے نام بڑے آدمیوں کے بچوں کی طرح نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس لئے غریب لوگوں کے بچوں کے نام کلو. خیراتی، خدابخش. اللہ رکھاوغیرہ ہوتے تھے۔

۴۔ ان کو اجازت نہیں تھی کہ اشراف اور بڑے لوگوں کو اسلام علیکم کہہ کر مخاطب کرتے۔ کیونکہ یہ طرز تخاطب صرف برابر کےلوگوں کے لئے تھاچھوٹے درجہ کے لوگ "آداب" اور "بندگی" کہاکرتے تھے۔

اس سے اس بات کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کبھی بھی مسلمان معاشرہ میں مساوات نہیں رہی اور سماجی حیثیت سے یہ اعلیٰ و نچلی ذاتوں میں بٹارہا۔ خاص طور سے وہ لوگ جو مقامی تھے اور مسلمان ہوئے انہیں کبھی بھی عزت سے نہیں دیکھا گیااور انہیں ہمیشہ حقیر سمجھا گیا۔ حالانکہ ان میں اکثر نے خود کو غیر ملکی بھی بنایا. مگر پھر بھی ان کا سماجی رتبہ غیر ملکی مسلمانوں کے برابر نہ ہوسکا۔

—٦—

نئے آنے والوں کی اکثریت فوجیوں. منتظموں، شاعروں. ادیبوں اور علماء وفقہاء کی ہوا کرتی تھی۔ اس لئے یہ نووارد طبقہ اعلیٰ میں شامل ہوکر. اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو جاتے تھے. طبقہ اعلیٰ کے یہ لوگ شہروں میں رہتے تھے۔ کیونکہ شہر حکمرانوں صوبائی گورنروں اور انتظامیہ کے مرکز ہوا کرتے تھے۔ اس لئے ان کی آبادی نے ہندوستان میں بڑے بڑے شہروں کی زندگی بدل کر رکھ دی. اور ان شہروں میں وسط ایشیاوایران کی ثقافت کو زبردست فروغ ہوا۔

حکمران طبقے اپنی ضروریات کی غرض سے کارخانے قائم کرتے تھے جن میں غلام اور ہنرمند و دست کار ملازمت کیا کرتے تھے. اور امراء کے ذوق اور پسند کے مطابق یہ لباس، ظروف. فرنیچر، زیورات اور آرائش کی چیزوں میں نئی نئی جدتیں پیدا کرتے تھے، امراء کے طرز رہائش اور عادات واطوار نے شہروں میں ایک اعلیٰ و برتر ثقافت کو پیدا کیاجو دیہاتوں سے

مختلف تھی۔ اس کی بنیاد اس دولت پر تھی، جو دیہاتوں سے شہروں میں آئی تھی. کیونکہ دیہات والے اپنی زائد پیداوار شہروں کے حوالے کر دیتے تھے مگر شہر اس تبادلہ کے عوض انہیں کچھ نہیں دیتے تھے. کیونکہ گاؤں کی ضروریات غربت و مفلسی کی وجہ سے بہت کم ہوتی تھی اور یہ وہ گاؤں میں رہتے ہوئے پوری کر لیتے تھے۔ اس لئے ان کی پیداوار پر شہروں کی آبادی و رونق اور دربار کی شان و شوکت ہوا کرتی تھی۔

شہروں میں بادشاہ اور امراء محلات. باغات. قلعے. بارہ دریاں اور مقبرے بنوایا کرتے تھے۔ ان کی تفریحوں و مشاغل جن میں رقص و موسیقی، شاعری. جلسہ و جلوس ہوا کرتے تھے. وہ بھی شہروں ہی میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ ان کی غذا اور لباس بھی دیہاتوں سے مختلف تھی. اور سب سے بڑی بات یہ کہ شہروں میں رہنے والے حکمران طبقوں کی زبان فارسی تھی جو دیہاتوں میں نہ بولی جاتی تھی اور نہ ہی سمجھی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے غیر ملکی اہل زبان ہوا کرتے تھے اور وہ زبان کی وجہ سے مقامی مسلمانوں پر فوقیت رکھتے تھے. کیونکہ دربار میں بھی فارسی زبان ہی کی سرپرستی کی جاتی تھی اور مقامی زبانوں کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔

ہندوؤں کے زمانہ میں بھی نچلی ذات کے لوگ شہروں سے باہر رہا کرتے تھے اور بہت کم شہروں میں داخل ہوتے تھے مسلمان حکمران طبقوں کو چونکہ ملازموں اور خدمت گاروں کی ضرورت ہوتی تھی اس لئے انہوں نے انہیں شہر میں آنے کی اجازت دے دی اس وجہ سے شہروں کی آبادی میں اضافہ ہو گیا. اور انہیں سستی مزدوری آسانی سے مہیا ہو گئی۔

اس وجہ سے شہروں میں رہنے والے غیر ملکی مسلمان حکمران طبقوں کی ثقافت علیحدہ بنیادوں پر پروان چڑھی. دیہات میں رہنے والوں کی اکثریت ہندوؤں کی تھی یا پھر مقامی مسلمان۔ یہ لوگ برادریوں کی شکل میں رہتے تھے اور پرانی رسومات اور روایات کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔ اس لئے ان میں اور ہندوؤں میں بہت سی ثقافتی روایات مشترک تھیں۔ اس لئے شہری اور دیہاتی ثقافت نے غیر ملکی اور مقامی مسلمانوں کے درمیان فاصلے اور بڑھا دیئے۔ مقامی مسلمانوں کا اگرچہ زمین سے رشتہ تھا. وہ اپنی برادریوں کے رواجوں میں

جکڑے ہوئے تھے. اور ذہنی طور پر ان کا تعلق ہندوستان کی روایات سے تھا، مگر مذہب نے انہیں سب سے کاٹ کر اپنے ہی ملک میں اجنبی بنا دیا۔ وہ جسمانی طور پر تو ہندوستان میں رہتے تھے مگر روحانی طور پر ان کا لگاؤ ہندوستان سے باہر قائم ہو گیا اور ان کی سیاسی و مذہبی وفاداریوں کے مرکز بھی ہندوستان سے باہر ہو گئے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ انہیں مسلمان معاشرہ میں مساوی درجہ بھی نہیں ملا. اور مسلمان ہونے کے بعد وہ اپنے قدیم کلچر سے بھی کٹ گئے۔ اس نے انہیں اس قدر احساس کمتری میں مبتلا کر دیا کہ ان کی تمام ذہنی صلاحیتیں اور تخلیقی عمل بالکل ختم ہو گیا. اس لئے پورے عہد میں کوئی نامور شاعر و ادیب. عالم و فقیہہ. جنرل و سپہ سالار اور وزیر و منصب دار مقامی مسلمان نہیں ہوا۔

مسلمان حکمران اور حکمران طبقے جب بار بار خود کو حامئ دین اور اسلام کا محافظ کہا کرتے تھے. اس سے ایک عام مسلمان کو یہ تاثر ملتا تھا کہ مسلمان ہونے کے ناطے اس کی حکومت ہے ان جذبات سے فائدہ اٹھا کر حکومت ان سے مذہب کے نام پر ہندوؤں سے جنگ میں ملوث کرتی تھی. اور بطور سپاہی یہ جنگ کا ایندھن بنتے تھے۔

— ۷ —

ان حالات میں ہندوستان کے مسلمان معاشرہ میں دو قسم کے اثرات پیدا ہوئے۔ انہیں ہندوستان سے کوئی محبت اور لگاؤ نہیں رہا کیونکہ وہ اسے کفر اور شرک کی سرزمین سمجھتے تھے اور یہاں کی اکثریت کو کافر اور مشرک۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے اس مشرکانہ ماحول میں وہ اپنے مذہبی فرائض پورے طریقہ سے سرانجام نہیں دے سکتے اس لئے وہ ہندوستان کی سرزمین سے اجنبی ہوتے چلے گئے اور ان کا رشتہ اس ملک سے ٹوٹ گیا. ان کی عقیدت کے مرکز ہندوستان سے باہر رہے جن سے ان کا ایک رومانوی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے وصیت نامہ میں اس رجحان کی نمائندگی کی ہے:

> "ہم لوگ اجنبی ہیں کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد سرزمین ہند میں بطور اجنبی کے آئے تھے اور ہمارے لئے عربی نسب اور عربی زبانوں دونوں باعث فخر ہیں۔

ہم تا بہ مقدور عرب کی جو آنحضرت صلعمؐ کا مولد ہے۔ عادات و رسوم کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ عجم کی رسموں اور ہندوؤں کی عادات کے نزدیک نہ پھٹکیں"۔ (۹)

شاہ ولی اللہ اس وصیت میں ان غیر ملکی مسلمانوں سے مخاطب ہیں جو ہندوستان میں آئے۔ ان میں خصوصیت سے عرب سے آنے والوں سے اور مقامی مسلمانوں کے ذہن اور ان کے جذبات کے بارے میں نہیں کوئی تجربہ نہیں۔ یہ عجم کی رسموں اور ہندوؤں کی عادات دونوں کو برا کہتے ہیں اور اسلام کے پھیلاؤ کو مزید سمیٹ کر صرف عرب میں محدود کر دیتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ سے پہلے اور بعد کے علماء مسلسل مسلمان معاشرے اور ان کی اندر جاتی ہوئی جڑوں کو مسلسل زمین سے باہر نکالتے رہے اور ہندوستان کی سرزمین کو ان کی وفاداریوں کا مرکز نہیں بننے دیا۔ اس ذہنیت کی مثال اس سے ملتی ہے کہ جب بنگال میں مذہبی مسئلہ مسائل کی کتابیں بنگالی زبان میں لکھنا شروع ہوئیں تو مصنفین میں جن میں علماء بھی شامل تھے یہ معذرت کی کہ وہ مذہبی کتابوں کو ہندو رسم الخط میں لکھ کر بے ادبی کر رہے ہیں۔ وہ اس سے واقف ہیں کہ یہ ناپاک زبان ہے مگر عوام کی خدمت کے لئے اسے مجبوراً استعمال کر رہے ہیں۔

حاجی محمد نے جو ایک مذہبی عالم تھا کہا کہ اگرچہ میں ہندو رسم الخط میں لکھنا تو نہیں چاہتا۔ مگر لوگوں کو علم دینے کے لئے یہ کوشش کر رہا ہوں اس لئے اسے ہندو رسم الخط میں دیکھ کر نظر انداز مت کرنا اور بنگالی میں پڑھ کر نفرت مت کرنا۔

ایک اور مذہبی عالم عبدالنبی نے کہا کہ میں دل میں ڈر رہا ہوں کہ خدا مجھ پر ناراض ہو گا کہ میں نے مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کو کیوں بنگالی میں لکھا۔

عبدالحکیم نے اس مسئلہ پر رائے دیتے ہوئے کہا کہا عربی کا جاننا سب سے اچھا ہے. اگر عربی نہ سیکھ سکو تو فارسی سیکھو۔ اگر وہ بھی نہ سیکھ سکو تو پھر مجبوراً مذہبی کتابیں اپنی زبان میں پڑھو۔ (۲۰)

دوسرا اثر مسلمانوں کے طبقہ میں یہ ہوا کہ یہ مختلف طبقوں اور ذاتوں میں بٹ گئے اور ان میں اتحاد کی کوئی علامت پیدا نہیں کی۔ مذہب اگرچہ ایک مشترک عنصر ضرور تھا. مگر سماجی فرق کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے قریب نہ تھے اور ثقافتی طور پر ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ تھے۔ ان دو اثرات نے مسلمان معاشرے کے فرد کو زمین اور معاشرہ دونوں سے جدا کر دیا اور ان میں تحفظ کا احساس ختم ہو گیا اس لئے ان کے معاشرے کی جو ذہنیت بنی وہ ایک ایسے معاشرے کی ذہنیت تھی جس کی اس سرزمین میں کوئی جڑیں نہ تھیں. جسے اپنے سماج سے کوئی لگاؤ نہیں تھا اور جسے اس علاقہ سے کوئی انس نہیں تھا۔ اس لئے ان کے نزدیک سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ خود کو معاشی طور پر مستحکم کریں اور جائز و ناجائز طریقہ سے دولت اکٹھی کریں اور اگر مواقع مل جائیں تو ہجرت کر کے دوسرے ملک میں چلے جائیں۔

اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس پورے دور میں اس قسم کی مذہبی تحریکیں اٹھتی رہیں جو ہندوؤں سے ہر قسم کے ملاپ اور اشتراک کے خلاف تھیں کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے میں ضم نہ ہو جائیں۔ اس لئے بار بار مذہب کو خالص روایات اور اقدار کی روشنی میں قائم کرنے کی کوششیں ہوئیں. مگر یہاں کوئی سماجی معاشی اور سیاسی تحریکیں نہیں اٹھیں کہ جو معاشرے کی محرومیوں کو ختم کر کے معاشرہ میں نچلے درجہ کے طبقوں کو مساوی مقام دلاتیں. ان سماجی اور معاشی تحریکوں کی کمی یا ان کا فقدان اس بات کی علامت ہے کہ ہندوستان کا مسلمان معاشرہ اس سرزمین سے کٹا ہوا تھا اور ان میں معاشرتی بہبود کا کوئی تصور نہیں تھا۔

ہندوستان کے مسلمان حکمران طبقوں کا تعلق چونکہ باہر کے ملکوں سے تھا. اس لئے انہوں نے ذہنی طور پر ہندوستان کی ثقافت کو غیر اسلامی اور کمتر سمجھتے ہوئے قبول نہیں کیا. اور یہ کوشش کرتے رہے کہ اپنی غیر ملکی ثقافت کو برقرار رکھیں. چنانچہ ہمارے ہاں تعلیمی اداروں میں نصاب میں جو علوم پڑھائے جاتے تھے اور جو کتابیں اس نصاب میں داخل تھیں. ان کا تعلق ایران. عرب اور وسط ایشیا سے تھا۔ ان کی کہانیاں. حکایات. قصے اور مثالیں سب وہاں کی تھیں۔ لیلیٰ و مجنوں. شیریں و فرہاد اور رستم و سہراب کی کہانیاں جو بچپن سے ہمارے ذہنوں پر اثر ڈالتی تھیں. ان کا ہندوستان سے کوئی تعلق نہیں تھا. حافظ. سعدیؔ. رومی و جامی اور فارسی کے تمام بڑے بڑے شعراء باہر کے تھے. مذہب میں تمام فقہی مسلکوں کا تعلق بھی ہندوستان سے باہر کے ملکوں سے تھا۔ تاریخ کی معلومات میں بھی ابتدائی عربوں کی تاریخ. اور وسط ایشیا و ایران کی تاریخ سے واقفیت تھی. اس کے نتیجہ میں جو ہندوستان میں مسلمانوں کا ذہن بنا اس کے بارے میں عبیداللہ سندھی لکھتے ہیں کہ:

"ایک ہندوستانی مسلمان کو جب دوسرے اسلامی ممالک میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو اسے اپنی ہندوستانیت سے نفرت سی محسوس ہونے لگتی ہے ...... اس کے ذہن میں ہندوستانیت اور اسلام دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ جب اسے اپنے مسلمان ہونے پر بزعم خود یقین ہوتا ہے تو وہ اپنے ذہن سے ہندوستانیت خارج کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اس کا سبب معلوم کرنا دشوار نہیں۔ بات یہ ہے کہ عام طور پر ہمارے ہاں مسلمان بیرون ہند کے علماء اور ائمہ کی کتابوں اور ان کی تعلیمات سے اسلام سیکھتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں شعوری اور غیر شعوری طور پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اور اس کی تعلیمات کے مرکز سارے کے سارے ہندوستان سے باہر ہی ہیں"۔ (۲۲)

— ۸ —

اس غیر ملکی ذہنیت کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے حکمران طبقوں نے اپنا تعلق ہندوستان سے باہر کے ملکوں میں رکھا اور مقامی مسلمانوں کے نچلے طبقوں سے کوئی ربط و ضبط نہیں رکھا۔ اس لئے جب کبھی بھی انہیں حکومت کو بدلنے کی ضرورت پیش آئی تو ان کا رویہ یہ ہوتا تھا کہ کسی غیر ملکی طاقت کی مدد سے حکومت کو تبدیل کیا جائے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ افغان امراء ابراہیم لودھی سے ناخوش ہوئے تو انہوں نے بابر کو ہندوستان آنے کی دعوت دے دی تاکہ وہ حکومت بدلنے میں ان کی مدد کرے اور پھر اقتدار ان کے حوالے کر دے لیکن تاریخ میں ہوتا یہی رہا ہے کہ جب ایک بار کوئی غیر ملکی طاقت اپنی قوت سے اقتدار حاصل کر لیتی ہے تو وہ اور کے حوالے نہیں کرتی۔ اس لئے بابر نے ابراہیم لودی کو شکست دے کر خود حکومت پر قبضہ کر لیا اور واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کی دوسری مثال احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان میں مرہٹوں کے خلاف بلانے کی ہے۔ ٹیپو سلطان نے بھی انگریزوں کے خلاف ترکی کے خلیفہ سے مدد کی درخواست کی تھی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں مسلمانوں کو اس کی توقع تھی کہ ایران کا بادشاہ ان کی مدد کو آنے والا ہے اور اس قسم کے اشتہارات جامع مسجد کی دیواروں پر لگے ہوئے تھے۔

یہ رجحان دو باتوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ ایک تو حکمران طبقوں میں اعتماد کی کمی اور معاشرے کے نچلے طبقوں سے ان کا کٹ جانا۔ دوسرے ہندوستان کی دوسری قوموں کی امنگوں اور ان کے عزائم کو نہ سمجھنا۔ اگر احمد شاہ ابدالی کے بجائے مرہٹوں سکھوں اور جاٹوں کو اقتدار میں شریک کر کے حکومت کی جاتی تو ہندوستان کی تاریخ پر اس کے اثرات دوسرے ہوتے اور یہ

متحدہ طاقت انگریزوں کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ یہ جب ہی ہو سکتا تھا کہ ہندوستان میں مسلمان معاشرہ نہ صرف اپنے اندر سے مقامی و غیر مقامی تفریق کو ختم کرتا بلکہ ہندوستان دوسری قوموں کے جذبات کو سمجھتا، اور ان سے مل کر اپنی جڑیں اس سرزمین پر پیوست کرتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا، اور تاریخ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو پے در پے صدمات سے دوچار کیا۔

حوالہ جات

شیخ اکرام: آب کوثر ص۔ ۲۳۶

۲۔ برنی: ۹۶ـ۹۹

۳۔ ایضاً: ۱۳۹

۴۔ ایضاً: ۳۳۱

۵۔ ایضاً: ۴۳۷

۶۔ ایضاً: ۴۳۸

۷۔ ڈاکٹر مبارک علی: تاریخ اور آگہی۔ لاہور ۱۹۸۶ء ص۔ ۲۶۶

۸۔ ایس۔ آر۔ شرما: مغلوں کی مذہبی پالیسی (انگریزی) آکسفورڈ ۱۹۴۰ء ۲۔۳

۹۔ علی شیر قانع: تحفتہ الکرام (اردو) کراچی ۱۹۵۹ء ص ۹۱۔ ۹۲

۱۰۔ شیخ محمد اکرام: آب کوثر ص۔ ۴۱

۱۱۔ ایضاً: ۳۰

۱۲۔ برنی: ۹۱۔ ۹۲

۱۳۔ ایضاً: ۸۹۔ ۹۰

۱۴۔ ایضاً: ۷۱۶۔ ۷۱۷

۱۵۔ برنیر: Travels in the Moghal Empire.
London 1914, p. 404

۱۶۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: ڈاکٹر مبارک علی: معاشرہ، ذات پات اور مرزا نامہ: (تاریخ اور روشنی) لاہور ۱۹۸۶ء

۱۷۔ تحفتہ الکرام: ۲۲۸ـ۲۲۹

۱۸۔ محمد میاں: علماء ہند کا شاندار ماضی: (دوم) دہلی ۱۹۵۷ء ص۔ ۱۰۳

۱۹۔ دربار ملی (مرتبہ۔ ایس۔ ایم۔ اکرام) لاہور ۱۹۶۶ء ص ۵۰۲

۲۰۔ ایم۔ روئے: The Islamic Syncretistic
Tradition in Bengal.
Prinction, 1983. P. 77, 78

۲۱۔ محمد سرور: افادات و ملفوظات حضرت مولانا عبداللہ سندھی۔ لاہور ۱۹۷۲ء ص ۲۰۳

علماء اور راسخ العقیدگی

"شریعت تلوار کی چھاؤں میں ترقی کرتی ہے" اس نے علماء کو سلطان وقت کی حمایت کرنے اور ان کے ساتھ اقتدار میں شریک ہونے پر تیار کیا، کیونکہ ایک مرتبہ جب علماء کو یہ احساس ہو گیا کہ وہ شریعت کو معاشرہ میں اخلاقی و ذہنی طور پر متاثر کر کے نافذ نہیں کر سکتے تو ان کے لئے صرف ایک ہی صورت تھی کہ حکومت کے ساتھ تعاون کریں اور قوت و طاقت کے ذریعہ مسلمانوں کے معاشرہ میں اس کا نفاذ کریں۔

اس لئے ہندوستان میں ان کی یہ کوششیں رہیں کہ وہ حکومت اور اس کے انتظامی اداروں پر قبضہ کریں، اور مذہب کے دباؤ کے تحت حکمران کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ حکومت کے عہدوں پر ایسے افراد کا تقرر نہ کرے جو مذہبی نہ ہوں، بد عقیدہ ہوں اور عقلیت کے پرستار ہوں، بلکہ یہ عہدے صرف ان لوگوں کو دیئے جائیں جو مذہبی امور میں ماہر ہوں عالم و فاضل ہوں، اور زندگی کے ہر شعبہ میں مذہب کا نفاذ چاہتے ہوں، چنانچہ التمش کو نصیحت کرتے ہوئے ایک بزرگ عالم مبارک غزنوی نے کہا تھا کہ:

> "دین پناہی سے متعلق جس میں بادشاہوں کی نجات ہے یہ ہے کہ وہ دین محمدیؐ کے احکام شرعی کے نفاذ کی ذمہ داری متقی، عبادت گزار، دین دار اور خدا ترس لوگوں کے سپرد کریں اور ناخدا ترس، ناحق شناس، حیلہ باز، لالچی، فریبی، اور اہل معاملہ کو حکومت شرع کی مسند اور طریقت کی سرکردگی، منصب افتاء اور علوم دین کی تدریس سپرد کئے جانے کو روا نہ رکھیں"
>
> (۱)

اس لئے خصوصیت سے ایسے عہدے جن کا تعلق مذہبی امور سے ہوتا تھا، وہ ان

علماء کو ملتے تھے ان میں قاضی، صدر الصدور، محتسب اور شیخ الاسلام کے عہدے قابل ذکر ہیں۔ اس حیثیت سے یہ حکمران طبقوں کا ایک حصہ بن جاتے تھے اور ان کی کوشش ہوتی تھی کہ یہ اپنے اثر و رسوخ کو حکومتی معاملات میں زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔ جب بھی حکمرانوں کو اپنے عمل اور پالیسی کو جائز ٹھہرانا ہوتا تھا تو ان سے فتوی طلب کئے جاتے تھے، جو یہ حکمرانوں کی مرضی کے مطابق دیا کرتے تھے۔

علماء کے نزدیک جس شخص نے دو باتوں کو پورا کر لیا وہ حکمران ہو سکتا تھا، اول اس کے پاس فوجی طاقت ہو، کہ وہ اس کے بل بوتے پر اپنے احکامات کو تسلیم کرائے، دوم اگر لوگ اس کے ہاتھ پر اقتدار کے حصول کے بعد بیعت کر لیتے تھے تو پھر وہ جائز حکمران ہوتا تھا۔ بیعت کرنے والوں میں بھی صرف علماء اور اہل حل و عقد کا ہونا کافی ہے۔ اس کے بعد جب وہ جائز حکمران ہو گیا، تو اب امت پر فرض ہے کہ وہ اس کی اطاعت کریں۔ اس اطاعت کے بدلہ میں حکمران امت کے سامنے جوابدہ نہیں ہے، کیونکہ یہ جوابدہی صرف خدا کے سامنے ہے۔

اس نظریہ کے تحت ہر اس غاصب کو جائز حکمران تسلیم کیا جاتا رہا، جس نے فوجی قوت و طاقت سے اقتدار پر قبضہ کیا، اور جب وہ ایک مرتبہ خدا کے سامنے جوابدہ ہو گیا تو اس نے عوام پر ظلم و ستم ڈھائے اس کی پوچھ گچھ کرنے والا اس دنیا میں کوئی نہیں رہا۔ اس کے نتیجہ میں مسلمان معاشرے میں مطلق العنان بادشاہوں کا عروج ہوا، اور آمرانہ حکومتی اداروں کی تشکیل ہوئی۔ مسلمان معاشرہ سلطان کے لئے طاقت و قوت، و دبدبہ اور شان و شوکت کا اس قدر چاہنے والا تھا کہ عہد سلاطین میں لکھی جانے والی کتاب "فتاویٰ قاضی خاں" میں ہے کہ اگر لوگ ایک ایسے شخص پر بیعت کر لیں جس کے پاس شان و شوکت اور رعب و دبدبہ نہیں ہے۔ تو اسے سلطان تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر کسی کے پاس طاقت و ہیبت ہے اور بیعت کے بعد وہ لوگوں پر ظلم و ستم بھی کرے تو اسے معزول نہیں کہا جا سکتا۔

(۲)

طاقت کا یہ تصور ہندوستان میں مسلمان معاشرہ کی ذہنیت کی بڑی عمدگی کے ساتھ

عکاسی کرتا ہے۔ ایک طبقاتی معاشرہ میں حکمران طبقوں کا تحفظ، ان کی مراعات سہولتیں اور مفادات کا تحفظ صرف اسی وقت ہو سکتا تھا، جب کہ حکمران طاقتور ہو اور اس قابل ہو کہ عوام کے احتجاج اور بغاوت کو کچل سکے۔ کیونکہ اقلیت، اکثریت کو بغیر طاقت کے خاموش نہیں رکھ سکتی ہے۔ اس لئے حکمران چاہے غاصب ہو اور ظلم و ستم کا عادی ہو مگر وہ حکمران طبقوں کے مفادات کی غرض سے جائز تھا، اور اس کے خلاف ہر قسم کی بغاوت کو مذہب کے خلاف بتایا جاتا تھا۔

حکمران کے اثر و رسوخ کو بڑھانے اور مستحکم کرنے کی غرض سے علماء اسے حامی دین اور پشت پناہ دین و ملت کے خطابات دے کر اس کی شخصیت کو معاشرہ میں ابھارتے تھے اور اس کی وسعت سلطنت کی جنگوں کو جہاد قرار دے کر اسے غازی اور مجاہد بناتے تھے۔ اس لئے ہندوستان کے تمام مسلمان بادشاہ اس زمرے میں آتے ہیں۔ یہ سب ہندوستان میں جہاد کی غرض سے آئے تھے اور ان کا مقصد تبلیغ اسلام تھا۔ اس لئے ان کی سامراجی جنگوں کو اسلام کے ذریعہ اخلاقی جواز فراہم کیا۔ اس کے نتیجہ میں ہندوستان میں اسلام کا تعلق جنگ و جدل اور غارت گری کے ساتھ مل کر ابھرا۔

ہندوستان میں حکومت کے قیام کے ساتھ ہی علماء نے مذہب کے ذریعہ اس کے استحکام کی بنیادیں فراہم کیں۔ اسلام کی برتری کا درس دیا، ہندو مذہب کو کفر اور شرک کہا، جس کی وجہ سے ہندو مذہبی و ثقافتی طور پر کمتر قرار پائے، اور اس منطق سے ان پر حکومت کرنا، ان سے جزیہ لینا، ان کے مندر توڑنا، ان کے تہوار پر پابندی عائد کرنا، اور ان کی مذہبی رسومات کو لہو و لعب قرار دینا جائز ہوا۔ اس فرق نے ہندو اور مسلمان معاشرے کو ایک دوسرے سے بالکل جدا کر دیا، اور یہی مقصد ان علماء کا تھا، کیونکہ ان کا اثر و رسوخ صرف اس وقت تک برقرار رہ سکتا تھا جب تک کہ علیحدگی کے جذبات شدید ہوں۔

— ۱ —

ترک فاتحین ہندوستان میں حنفی مسلک کو لے کر آئے تھے۔ اس لئے یہاں سنی علماء

کا اثر و رسوخ قائم ہوا اور انہوں نے مذہب کی اس تعبیر و تاویل کو یہاں متعارف کرایا جو کہ وسط ایشیا میں گیارہویں و بارہویں صدی میں علماء کر چکے تھے۔ ہندوستان میں صرف تقلید کی گئی اور کوئی اجتہادی کام نہیں ہوا۔ پورے دور میں ہندوستانی علماء نے وسط ایشیا و ایران اور عربی ممالک کے عالموں کی کتابوں پر یا تو حاشیہ لکھے، یا ان کی مزید وضاحت کی، مگر اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا. یہاں کے کسی عالم کے لئے باعث فخربات یہی تھی کہ اس نے کسی مشہور فقہی مسلک کے امام یا کسی غیر ملکی عالم کی کتاب پر کوئی تبصرہ لکھا ہو. مثلاً شاہ وجیہ الدین (وفات ۱۵۹۰ء) ایک بڑے عالم سمجھے جاتے تھے ان کے بارے میں ہے کہ شاید ہی کوئی چھوٹی یا بڑی درسی کتاب ہو جس کی انہوں نے شرح یا تفسیر نہ لکھی ہو۔ (۲)

علماء کی اکثریت کسی مسئلہ پر فتوی دیتے ہوئے پچھلے علماء اور فقہاء کی رائے کو دہرا دیتے تھے اور حالات کے مطابق کوئی نئی بات نہیں کہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حنفی فقہ کا ہندوستان میں کوئی ارتقاء نہیں ہوا. اور یہ فرضی حالات و تصوراتی ماحول میں کام کرتا رہا۔ (۳) فتاوی عالمگیر کو فقہ کی مستند کتابوں کی مدد سے تدوین کیا گیا مگر اس میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے تحت فتوی درج نہیں اس میں بھی محض تقلید کی گئی اور اجتہاد سے پرہیز کیا گیا اس لئے بدلتے ہوئے حالات میں فقہ کی مدون یہ کتابیں ہندوستان کے مسائل کا کوئی حل نہیں پیش کر سکیں۔

— ۲ —

وسط ایشیا و ایران میں منگولوں کے حملوں کے بعد دوسرے لوگوں کے ساتھ علماء و فقہا کی بڑی تعداد ہندوستان ہجرت کر کے آئی۔ یہ سخت قسم کے سنی العقیدہ تھے اور ان میں مذہبی رواداری نام کو نہیں تھی ہندوستان کے سیاسی حالات سے بالکل ناواقف تھے اور مسائل کو وسط ایشیا و ایران کے نقطہ نظر سے دیکھتے تھے۔ مہاجر ہونے کی حیثیت سے ان میں عدم تحفظ کا بھی شدید احساس تھا. اس لئے ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں مذہبی حکومت مضبوط بنیادوں پر ہو تاکہ انہیں ہندو اکثریت سے کوئی خطرہ نہیں رہے اور وہ دوبارہ سے اس

تباہی سے دوچار نہ ہوں جو منگول حملوں کے بعد وسط ایشیا و ایران میں آئی تھی۔ اس لئے وہ ہندوؤں کو کمزور اور ذلیل و خوار رکھنا چاہتے تھے تا کہ وہ کبھی بھی حکومت کے خلاف بغاوت کا سوچ بھی نہ سکیں۔

سنی علماء کا موقف تھا کہ صرف چار فقہی مسلکوں کی تقلید کی جائے تا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اتحاد برقرار رہے، اگر ان مسلکوں کی تقلید نہ کی گئی اور دوسرے مسلک بھی ظاہر ہوئے تو اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا۔ اس لئے ہندوستان کے مسلمان معاشرہ پر امام غزالی اور امام تیمیہ کے افکار کا اثر ہوا، امام غزالی اجتہاد کے مخالف ہیں اور امام تیمیہ غیر اسلامی عناصر کے خلاف، اسلام کی پاکیزگی کے داعی ہیں۔ اس لئے ان دونوں کے افکار کے لئے ہندوستان کی فضا راس تھی. جہاں اس کی تقلید کی گئی۔

اکبر کے زمانہ میں گجرات کی فتح کے بعد ہندوستانی علماء سمندر کے راستے سے بھی حجاز جانے لگے اور جو علماء وہاں سے تعلیم حاصل کر کے واپس آئے انہوں نے مزید ہندوستان کی فضا کو تنگ نظر بنایا۔ ہندوستان کے معاشرے میں یہ خیال یقین کی حد تک بیٹھا ہوا تھا کہ مذہبی تعلیمات اور مذہبی امور کی حقیقی تعلیم صرف ہندوستان سے باہر سمرقند، بخارا، کوفہ، دمشق و بغداد اور مکہ و مدینہ میں حاصل ہو سکتی ہے، کیونکہ وسط ایشیا، ایران، عراق و شام و حجاز کی فضا ایسی ہے کہ جہاں اسلامی علوم پروان چڑھ سکتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کا فروغ ہندوستان کے مشرکانہ اور کافرانہ ماحول میں ممکن نہیں۔ اس لئے ہندوستان میں صرف ان علماء کو مستند مانا جاتا تھا جو ان ملکوں سے علم کی سند لے کر آئے تھے۔ ہندوستانی علماء کے اعتماد کی کمی اس سے بھی نظر آتی ہے کہ وہ اکثر ہندوستانی معاملات کے بارے میں فتویٰ حجاز کے علماء سے منگواتے تھے، وہ بھی ان کی مرضی کے مطابق فتویٰ بھیجنے میں دیر نہیں کرتے تھے، حجاز کے علماء کے فتویٰ ہندوستانی علماء کے مقابلہ میں زیادہ وقیع اور مستند مانے جاتے تھے۔

اجتہاد کے فقدان اور تقلید کے اثرات کی وجہ سے ہندوستان میں راسخ العقیدگی کی جڑیں اس قدر گہری ہو گئیں کہ انہوں نے اس کے خلاف کسی فرقہ، مسلک، اور تحریک کو

برداشت نہیں کیا اور انہیں سختی کے ساتھ ختم کر دیا۔ نئے خیالات و افکار کو ختم کرنے کے سلسلہ میں انہوں نے جو طریقے اختیار کئے ان میں قتل کرانا، کتابیں جلانا، قید و بند، ایذائیں، ملازمتوں سے محروم کرنا، اور مالی طور پر ان کے ذرائع آمدنی بند کرنا تھے۔ سنی راسخ العقیدگی سے علیحدہ ہٹ کر جو بھی فرقے تھے ان کے بارے میں اس قسم کی باتیں پھیلائی جاتی تھیں کہ جن سے عوام میں ان کے لئے نفرت پیدا ہو۔ ان میں سب سے زیادہ تشہیر اس کی کی جاتی تھی کہ ان فرقوں کے ماننے والوں میں آزاد جنسی تعلقات ہوتے ہیں اس لئے ایسے فرقوں کو "اباحیہ" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

ان فرقوں کو اس بات کی قطعی آزادی نہ تھی کہ وہ اپنے عقائد کی تبلیغ کر سکیں، یا ان کے بارے میں آزادی سے بحث و مباحثہ کر سکیں، یا ان کی اشاعت کر سکیں، اس لئے یہ فرقے اس بات پر مجبور ہوئے کہ اپنے عقائد کو خفیہ رکھیں اور خفیہ اجتماعات کریں اس نے ان علماء کو یہ موقع دیا کہ ان کے بارے میں قسم قسم کی افواہیں پھیلائیں تاکہ لوگ ان سے بدظن ہوں اور ان کے قریب نہ جائیں۔

چونکہ تقلید پرست علماء نئے پیدا ہونے والے مسائل کا حل پیش کرنے سے قاصر تھے، اس لئے مذہب اور شریعت میں اس راسخ العقیدگی کے خلاف مختلف تحریکیں پیدا ہوئیں جنہوں نے روایتی مذہب سے علیحدہ ہو کر مسائل کا حل پیش کیا. مگر ایسی تمام تحریکوں اور جماعتوں کی سختی سے مخالفت کی گئی، اور انہیں قرامطی، الحادی، زندقہ. مانی و منردک کے پیرو کار کہہ کر سختی سے کچل دیا گیا۔ اس وجہ سے روشن خیال لوگوں کی ہمت نہیں رہی کہ وہ اس رجعت پرستی کے خلاف موثر جدوجہد کر سکیں۔

صوفیاء کے وحدت الوجودی طبقے نے جب شریعت کی سختی اور تشدد کی جگہ رواداری اور آزاد خیالی کی تبلیغ شروع کی تو علماء نے ان کے خلاف بھی سخت اقدامات کئے اور حکومت کی مدد سے ان کے اثر کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ اس پر کاری ضرب اس وقت لگی جب تصوف اور شریعت کو ملا کر اسے بھی علماء کے تابع کر دیا، اس سلسلہ میں وحدت الشہود کے نظریہ نے موثر کردار ادا کیا. اور صوفیاء و علماء کو آپس میں ملا کر راسخ العقیدگی کی جڑیں اور گہری کر

دیں۔ (۴)

— ۳ —

اکبر نے مغل حکومت کی بنیاد متحدہ قومیت پر رکھی تھی، مغلوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے طبقہ اعلیٰ کو بھی اقتدار میں شریک کر لیا تھا۔ اور عام ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری کا سلوک کرتے ہوئے ان پر سے مذہبی ٹیکس ختم کر دیئے تھے۔ اکبر کی یہ پالیسی تھی کہ ہندوستان میں کسی ایک قوم یا مذہب کی بنیادوں پر حکومت نہیں کی جائے کیونکہ ایسی حکومت کی بنیاد ناپائیدار ہوگی، جب تک تمام عناصر کو اس میں شریک نہیں کیا جائے اس کی بنیادیں مستحکم نہیں ہوں گی۔ اس لئے اس نے جب ہندوؤں کو اقتدار میں شریک کیا تو متحدہ قومیت کے لئے فضا پہلے سے تیار تھی، وحدت الوجود کے نظریہ اور بھگتی تحریک نے ذہنوں کو اشتراک کے لئے تیار کر رکھا تھا۔

اس اشتراک سے سنی امراء کو دکھ ہوا کیونکہ وہ بلاشرکت غیرے اقتدار پر قابض رہنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے علماء کی مدد سے اس کے خلاف تحریک چلائی اور ہر اس علامت کو مٹانا چاہا جو اشتراک کو قائم کئے ہوئے تھی۔ یہ مخالفت ہندوؤں سے بڑھ کر شیعوں تک آگئی کیونکہ اکبر کے زمانہ میں کافی شیعہ مغل حکومت میں شریک ہو چکے تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھی اس پس منظر کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "غیر ملکی حکمران طبقوں کا سیاسی اور فکری مرکز بخارا تھا۔ بخارا کی فقہ، بخارا کا علم کلام اور بخارا کے علماء کی کتابیں ہندوستان میں آئیں اور یہی مدرسوں کا نصاب بنا۔ علم فقہ کی طرح بخارا سے حکمرانوں کے گروہ بھی آتے رہتے تھے۔ اکبر کے عہد تک یہ ہوتا رہا کہ جب کبھی ہندوستان میں مسلمانوں کی قوت کمزور پڑتی تو اس نواح سے تازہ دم مسلمان آ جاتے اور اسلامی حکومت کے لئے یہ لوگ تقویت کا باعث بنتے۔ اکبر نے ہندوؤں کو مراعات دیں اور ایک حد تک مذہب میں ان کا مساوی درجہ ماننے کی بھی جرأت کی تو ان غیر

ملکی اور ان کے ہم خیال مسلمانوں میں بڑی بے چینی پھیلی، دوسری بات یہ ہوئی کہ اکبری سیاست کو چلانے میں شیعوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا. بخارا چونکہ سنیوں کا مرکز تھا اور یہ لوگ شیعیت کی مخالفت میں بڑے سرگرم بھی تھے، یہاں تک کہ بخارا میں جو نقشبندی طریقہ رائج تھا اس میں بھی شیعوں کے خلاف کافی رجحان موجود ہے، شیعہ سمجھتے تھے کہ وہ اکبری سیاست کی تائید کر کے دربار سے بخاری اور سنی اثر کم کر سکیں گے، چنانچہ جب اکبر کے خلاف ردعمل شروع ہوا تو شیعوں اور ہندوؤں پر عتاب آیا اور سنی حکمران طبقے دونوں کے مخالف ہو گئے۔" (۵)

اس تحریک کے سربراہ احمد سرہندی تھے جنہیں ان کے پیروکار مجدد الف ثانی کے نام سے پکارتے ہیں ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں سنی مسلمانوں کے اتحاد کو کمزور کرنے والی قوتوں میں شیعہ، مہدوی اور وحدت الوجود صوفی ہیں بیرونی قوتوں میں ہندو اثرات اسلامی شعار کو ختم کر رہے ہیں اور مسلمان ہندو مذہب کے زیر اثر اسلامی شعار ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس لئے انہوں نے کوشش کی کہ امراء کی مدد سے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنائیں۔ کیوں کہ یہ تحریک جن سیاسی حالات کے تحت وجود میں آئی تھی اس سے سنی امراء کے مفادات وابستہ تھے. اس لئے انہوں نے اس کا پورا پورا ساتھ دیا۔ انہوں نے ایک مغل امیر شیخ فرید کو خط میں لکھا کہ:

"پس اسلام کی عزت کفر اور کافروں کی خواری میں ہے جس نے اہل کفر کو عزیز رکھا اس نے اہل اسلام کو خوار کیا ان کے عزیز رکھنے سے فقط تعظیم کرنا اور بلند بٹھانا ہی نہیں. بلکہ اپنی مجلس میں جگہ دینا اور ان کی ہم نشینی کرنا اور ان کے ساتھ گفتگو کرنا سب اعزاز میں داخل ہے۔ کتوں کی طرح ان کو دور رکھنا چاہئے اور اگر دنیاوی غرض ان سے متعلق ہوں، جو ان کے بغیر حاصل نہ ہوتی ہوں تو پھر بھی بے اعتباری کے طریق کو مدنظر رکھ کر بقدر ضرورت ان کے ساتھ میل رکھنا چاہئے اور کمال اسلام تو یہ ہے کہ اس دنیاوی غرض

سے بھی در گزر کریں اور ان کی طرف نہ جائیں" (٦)

وہ بار بار اپنے خطوں میں اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ کفار آزادی سے اپنے مذہبی فرائض بجالا رہے ہیں، نئے مندر تعمیر کر رہے ہیں، وہ گائے کی قربانی سے روکتے ہیں ان کا یہ رویہ اس بات کی پوری پوری غمازی کرتا ہے کہ وہ صرف سنی العقیدہ جماعت کے لئے ہر قسم کی مذہبی آزادی چاہتے تھے اور دوسرے فرقوں اور مذہبوں کے ماننے والوں کو یہ آزادی دینے پر تیار نہیں تھے۔ اس سلسلہ میں وہ شیعوں کے بھی زبردست مخالف تھے۔ پروفیسر مجیب نے ان کے تاریخی کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کو مجدد اور امام کے جو خطاب دیئے گئے اور ان سے جو کارنامے منسوب کئے گئے کہ انہوں نے اکبر کے الحاد کے خلاف جنگ لڑی اور دربار کی رسومات کو اسلامی بنایا، یہ سب باتیں ان کے مریدوں کی پھیلائی ہوئی ہیں ان کا یہ کارنامہ، اگر اسے کارنامہ کہا جائے ضرور ہے کہ انہوں نے سنیوں کی جانب سے شیعوں سے جنگ لڑی، راسخ العقیدگی کو تقویت دی، اور ریاست و نقشبندی سلسلہ کو قریب لائے۔ انہوں نے امراء کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں اکثر خطوط میں ان کا لہجہ خوشامدی ہے اس موقع پر بقول پروفیسر مجیب "احساس ہوتا ہے کہ ان کی شریعت کے لئے کوششیں دنیاوی معاملات میں تبدیل ہو گئیں" (۷)

مغل دربار کے سنی امراء اس وقت کامیاب ہو گئے جب اورنگ زیب کو تخت و تاج مل گیا اس کے بعد انہوں نے راسخ العقیدگی کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔ وحدت الوجودی صوفیاء کے خلاف تحریک چلائی اور اس سلسلہ میں محبّ اللہ الہ آبادی کی کتابیں جلانے کا بادشاہ سے حکم دلوایا۔ (۸) فتاوی عالمگیر کی تدوین ہوئی، راجپوتوں، مرہٹوں، سکھوں اور شیعہ ریاستوں سے مسلسل جنگیں لڑی گئیں، اس سلسلے میں علماء نے اورنگ زیب کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اسی لئے جب اسے داراشکوہ اور سرمد کو قتل کرانے کی ضرورت پیش آئی تو علماء نے بغیر کسی توقف کے ان کے خلاف کفر کا فتوی دے دیا۔

لیکن یہ راسخ العقیدگی مغل سلطنت کو اور مسلمان معاشرہ کو زوال پذیر ہونے سے نہ روک سکی۔ ان علماء نے زہد و تقوی کی بجائے دنیاوی فوائد حاصل کرنے میں اپنا وقت

گزارا۔ اورنگ زیب کے قاضی القضاۃ قاضی عبدالوہاب (وفات ۱۶۷۵) کے نے پر ان کے پاس ایک لاکھ اشرفیاں اور پانچ لاکھ روپیہ نقد نکلا۔ زیور اور جواہرات اس کے علاوہ تھے۔
(۹) یہی رویہ دوسرے علماء کا تھا جو حکومت کی سرپرستی میں دنیاوی فائدہ حاصل کرنے میں مصروف تھے اور اس وجہ سے وہ معاشرہ میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کے سخت مخالف تھے۔

—۴—

چونکہ تعلیمی اداروں پر علماء کا قبضہ رہا اس لئے انہوں نے ان کی مدد سے نہ صرف راسخ العقیدگی کو مضبوط کیا بلکہ آزاد خیالی کے تمام رجحانات کو ختم کرنے کا بھی کام کیا۔ ان اداروں میں جو نصاب پڑھایا جاتا تھا وہ مروجہ عقائد اور روایات کو برقرار رکھنے میں مدد دیتا تھا۔ اور اس میں اس قسم کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ ذہن میں نئے اور جدید خیالات پیدا ہوں۔ اس لئے وہ تمام علوم جو ذہنی جمود کو توڑتے اور فکر کو برانگیختہ کرتے وہ اس نصاب میں شامل نہیں تھے۔ خصوصیت سے فلسفہ کو تعلیمی اداروں سے بالکل ختم کر دیا تھا۔ کیونکہ انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ فلسفہ غور و فکر اور سوچنے کے جذبات پیدا کرتا ہے اور ذہن میں شک و شبہ کو پروان چڑھاتا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی عقلی اور فطری علوم کی افادیت تسلیم نہیں کرتے اور فلسفوں کو گمراہ سمجھتے ہیں۔ اسی قسم کے خیالات کا اظہار احمد سرہندی نے بار بار اپنے خطوط میں کیا ہے:

"بعض لوگوں نے جو علوم فلسفہ سے تعلق رکھتے ہیں اور فلسفی تسویلات پر فریفتہ ہیں ان کو حکماء جان کر انبیاعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے برابر سمجھتے ہیں، بلکہ ان کے جھوٹے علوم کو سچا جان کر انبیاء کی شرائع پر مقدم سمجھتے ہیں ...... غرض ان کی اور ان کے علوم کی تصدیق سے انبیاء اور ان کے علوم کی تکذیب لازم آتی ہے کیونکہ یہ دونوں علم ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ اب جو چاہے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مذہب کو لازم پکڑے اور اللہ تعالیٰ کے گروہ

میں شامل ہو جائے اور چاہے فلسفی بن جائے اور شیطان کے گروہ میں داخل ہو جائے" (۱۰)

شیخ احمد سرہندی علم ریاضی کو بھی ایک بے ہودہ علم گردانتے ہیں کہ جس کا کوئی فائدہ نہیں حکماء اور فلسفیوں کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ:

"یہ لوگ بہت ہی بے خود اور بیوقوف ہیں اور ان سے زیادہ کمینہ اور بیوقوف واحمق وہ شخص ہے جو ان کو دانا اور عقلمند جانتا ہے۔ ان کے منظم اور مرتبہ علوم میں ایک علم ہندسہ ہے جو محض لایعنی اور بے ہودہ اور لاطائل ہے، بھلا مثلث کے تینوں زاویہ قائم کے ساتھ برابر ہونا کس کام آئے گا۔" (۱۱)

امام ابن تیمیہ جن کے خیالات و افکار کا ہندوستان پر اثر ہوا، ان کے ایک شاگرد امام عبدالعزیز اردبیلی، محمد تغلق کے زمانہ میں ہندوستان میں آئے۔ وہ بھی طبیعات اور ریاضی کو اخلاق اور مذہب سے متضاد سمجھتے تھے۔ اور ان کے خیال میں ان سے نہ تو عذاب الٰہی سے رستگاری ہوگی اور نہ سعادت و برکت۔ اس لئے صرف وہ علوم حاصل کرنے چاہئیں جن سے مذہب و شریعت کو مدد ملے (۱۲) فلسفیوں کے خلاف علماء کا یہ ردعمل مسلمان معاشرہ میں ابتدا ہی سے رہا۔ سلطان التمش کو مشورہ دیتے ہوئے مبارک غزنوی نے کہا تھا کہ:

"فلاسفہ، علوم فلاسفہ اور معقولات فلاسفہ پر اعتقاد رکھنے والوں کو اپنی سلطنت میں نہ رہنے دیں اور جس طرح بھی ممکن ہو علوم فلاسفہ کی تعلیم نہ ہونے دیں اور بدمذہب اور بلا عقیدہ لوگوں کو اہل سنت و جماعت کے مخالفوں کی توہین و تذلیل میں کوشش کرتے رہیں، اور کسی بد دین، بدمذہب اور بد عقیدہ شخص کو حکومت میں نہ داخل ہونے دیں" (۱۳)

برنی سلطان محمد تغلق کے بارے میں شکایتیں کرتے ہوئے اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ اس نے چند فلسفیوں کو دربار میں اپنے قریب کر لیا "سعد منطقی بدمذہب، عبید شاعر

بد اعتقاد اور نجم انتشار فلسفی کی صحبت میں پڑ گیا" محمد تغلق مولانا علیم الدین جو فلسفہ کے بڑے عالم تھے ان سے متاثر ہوا اور بقول برنی ان کی وجہ سے سلطان مذہب سنت والجماعت سے بد اعتقاد ہو گیا. وہ سلطان کی تمام کمزوریوں اور اس کے عہد میں ہونے والی تمام خرابیوں کی ذمہ داری فلسفہ و معقولات کو دیتا ہے۔ (۱۴)

۵

علماء نے فنون لطیفہ کی مخالفت کرتے ہوئے رقص، موسیقی، مصوری اور سنگ تراشی کی مخالفت کی اس لئے معاشرہ میں ان لوگوں کو جو ان فنون کے ماہر تھے، انہیں سماجی طور پر اعلیٰ اور بلند مقام نہیں ملا، اور خود وہ لوگ جو ان فنون سے متعلق تھے وہ خود کو کمتر اور مجرم سمجھتے تھے اور احساس گناہ ان کے اندر ہی اندر پرورش پاتا تھا. اس لئے ہمارے معاشرے میں موسیقار، رقاص، اور مصور، مراثی، بھانڈ، اور سوانگ بھرنے والوں سے آگے بڑھ کر قابل احترام نہیں بن سکے. فنون لطیفہ طبقہ اعلیٰ میں محدود رہا اور یہ عوامی سطح پر مقبول نہیں ہو سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فنون لطیفہ کے اثر سے جو انسانی جذبات میں نکھار پیدا ہوتا ہے اس سے ہمارا معاشرہ محروم رہا. طاؤس ورباب کو محض عیش و عشرت فسق و فجور اور لہو و لعب کی علامت سمجھا گیا اور اصل طاقت شمشیر و سناں میں ٹھہری۔

عربی زبان کو علمانے مذہبی زبان کی حیثیت سے برقرار رکھا. اور اپنی قابلیت کا اظہار تحریر و تقریر کے ذریعہ اسی زبان میں کرتے تھے. ان کی کتابیں. رسائل. اور فتوی عربی میں ہوتے تھے یا پھر فارسی کو ثانوی درجہ دیا گیا مگر مقامی زبانوں میں نہ تو یہ علوم پڑھائے جاتے تھے اور نہ ہی علماء کو ان زبانوں میں دسترس حاصل تھی۔ شاہ ولی اللہ اپنی وصیت میں لکھتے ہیں کہ:

> "ہم میں سے خوش قسمت وہ ہے جو عربی زبان کی صرف و نحو اور اس کی کتب ادب سے مناسبت پیدا کرے. حدیث و قرآن میں اسے درک حاصل ہو۔ فارسی و ہندی کی کتابیں علم شعر، معقولات، اس سلسلہ کی جو دوسری

چیزیں پیدا ہو گئی ہیں ان میں مشغول ہونا اور تاریخ بادشاہوں کی سرگزشتوں اور صحابہؓ کے باہمی نزاعات کا مطالعہ کرنا گمراہی در گمراہی ہے" (۱۵)

ہندوستان کے مسلمان معاشرے میں علماء کی ان کوششوں سے اور حکمت کے اثر و رسوخ کی وجہ سے تمام علوم کو محدود کر کے رکھ دیا، فلسفہ، ریاضی، تاریخ اور سائنس کی تعلیمات کو مذہب کے لئے خطرناک سمجھتے ہوئے ان کو ابھرنے نہیں دیا اور مذہبی علوم میں بھی محض تقلید پر زور دیا گیا اور ہر نئی چیز کے خلاف سخت اقدامات اٹھائے گئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی علماء نے کوئی تخلیقی کام نہیں کیا، یہاں کوئی بڑا مجتہد، محدث اور عالم پیدا نہیں ہوا اور وہ تمام مذہبی روایات جو وسط ایشیا و ایران و عرب ملکوں سے یہاں آئی تھیں۔ انہیں بغیر کسی تبدیلی و ردو بدل کے یہاں رہنے دیا۔ ہندوستان کے علماء نے خود کو یہاں کے معاشرہ اس کے مسائل اور اس کی ضروریات سے بے خبر رکھا اور دوسری قوموں سے علیحدہ انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک علیحدہ خول میں مقید کر دیا جو وقت کے ساتھ ساتھ دن بدن سکڑتا چلا گیا اور بالاآخر تنگ نظری تعصب اور فرقہ پرستی نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے روبہ زوال کر دیا۔

—۶—

سیاسی زوال کے ساتھ ہی راسخ العقیدگی بھی کمزور ہو گئی۔ یہاں تک کہ شاہ ولی اللہ کے زمانہ میں علماء ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے تھے۔ مذہب کے نام پر بار بار جوش دلانے پر بھی مسلمانوں میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی تھی. کیونکہ ایک طویل دور میں تقلید کے عمل نے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو ختم کر دیا تھا، ان کی تخلیقی اپج کے راستہ بند ہو چکے تھے اور غور و فکر کی راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ وہ ایک منجمد اور ٹھہرے ہوئے ماحول میں رہنے کے عادی ہو چکے تھے۔ بوسیدگی و خستگی ان کا مقدر بن چکی تھی، ایسے میں اگر نئی اور ابھرتی ہوئی اقوام کے ہاتھوں انہیں بار بار شکست ہو تو یہ تعجب کی بات نہ تھی۔

شاہ ولی اللہ معاشرہ کی سیاسی، سماجی اور معاشی ٹوٹ پھوٹ کا تجزیہ کرنے کے بجائے،

حکمران طبقوں سے پھر یہ امید کرتے ہیں کہ وہ ابتدائی مسلمان فاتحین کی طرح جنگ کے ذریعہ اور قوت و طاقت کے ذریعہ دوبارہ سے اپنا اقتدار قائم کر لیں گے، شاہ ولی اللہ کی امیدوں کا مرکز بادشاہ، امراء اور فوج تھی وہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی طاقت کا احیاء چاہتے تھے اور ہندوؤں کی ابھرتی ہوئی طاقت کو کچل کر تلوار کی چھاؤں میں شریعت کے نفاذ کے خواہش مند تھے، وہ بادشاہوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ:

"اے بادشاہو! اس زمانہ میں ملاء اعلیٰ کی مرضی یہ ہے کہ تم تلوار کھینچ لو اور اس وقت تک انہیں نیام میں نہ ڈالو جب تک اللہ مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان دو ٹوک فیصلہ نہ کر دے اور جب تک سرکش کافر اور فاسق اپنے میں کمزوروں سے جا کر نہ مل جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وقاتلوھم حتی لاتکون فتنہ ویکون الدین کلہ للہ (تم ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کا ہو جائے) (۱۶)

اس کے بعد وہ فوجیوں سے مخاطب ہوتے ہیں:

اے فوجیو! اللہ نے تمہیں جہاد کے لئے نکالا تھا تاکہ تم کلمہ حق کو ظاہر کرو اور شرک اور اہل شرک کو دباؤ۔ تم نے رباط الخیل (لڑائی کے لئے گھوڑے باندھنا) اور اسلحہ بندی کو ایک ذریعہ معاش بنالیا ہے اور اس کے ذریعہ بغیر جہاد کی نیت کے اور مقصد کے تم زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرتے ہو، تم شراب اور بھنگ پیتے ہو، تم نے داڑھیاں منڈوا رکھی ہیں، مونچھیں بڑھا لی ہیں اور لوگوں پر ظلم کرتے ہو اور جہاں سے بھی مل جاتا ہے بے پرواہ ہو کر کھالیتے ہو" (۱۷)

لیکن شاہ ولی اللہ ہندوستان میں مسلمان معاشرہ کے تاریخی عمل کو نہیں سمجھ سکے ہندوستان میں مسلمان طبقوں کا زوال اس لئے ہوا کہ راسخ العقیدگی نے ان کے ذہنوں پر تالے لگا دیئے تھے اور سنی العقیدہ جماعت کے علاوہ دوسرے تمام فرقوں کو علیحدہ کر کے اتحاد اور قوت کو توڑ دیا تھا۔ یہ بے حسی اس لئے نہیں تھی کہ لوگ مذہب سے دور تھے بلکہ

اس لئے تھی کہ راسخ العقیدگی ان کے مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہو گئی تھی اور ان کی محرومیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ علماء نے عوام سے اپنا رشتہ توڑ کر اپنا تعلق حکمرانوں سے رکھا تھا، اس لئے جب حکومت کو زوال ہوا تو اس کے ساتھ ہی ان کا بھی زوال ہو گیا۔

حوالہ جات

۱۔ ایم مجیب: ہندوستانی مسلمان (انگریزی) لاہور ۱۹۸۶ء ص ۶۴

۲۔ شیخ محمد اکرام: رود کوثر، ص۔ ۳۹۴

۳۔ ایم مجیب: ۵۸۔۵۹

۴۔ شیخ محمد اکرام: ص۔ ۲۸۶

۵۔ محمد سرور: ص۔ ۳۳۸۔۳۳۹

۶۔ شیخ محمد اکرام: ص۔ ۳۲۰

۷۔ ایم مجیب: ص۔ ۲۴۷

۸۔ ایضاً: ۳۱۰

۹۔ شیخ محمد اکرام۔ ص۔ ۴۶۱

۱۰۔ ایضاً۔ ۱۷۱

۱۱۔ ایضاً۔ ۱۷۰

۱۲۔ محمد حنیف ندوی: عقلیات ابن تیمیہ، لاہور ۱۹۸۱ء، ص۔ ۱۰

۱۳۔ برنی۔ ۹۸

۱۴۔ ایضاً۔ ۲۶۱۔۲۶۳

۱۵۔ محمد سرور: ارمغان شاہ ولی اللہ۔ لاہور ۱۹۷۱ء، ص۔ ۵۲۰

۱۶۔ ایضاً۔ ۳۶۲۔۳۶۳

۱۷۔ ایضاً۔ ۳۶۴

صوفیا اور معاشرہ

صوفیا کے تمام بڑے بڑے سلسلہ چشتیہ، سہروردیہ. قادریہ، نقشبندیہ. اور فردوسیہ کا تعلق ہندوستان سے نہیں بلکہ ایران و عراق اور وسط ایشیا سے تھا بعد میں ان کے پیرو کار ان سلسلوں کو ہندوستان میں لائے اور انہیں یہاں رائج کیا ان میں سے تین سلسلے. چشتیہ، سہروردیہ اور قادریہ ہندوستان میں کافی مقبول ہوئے. اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں عربی اثرات کے بجائے عجمی افکار غالب تھے. اور اسی وجہ سے ان میں غیر عربی رسومات. طور طریق اور عادات کے لئے رواداری تھی، شریعت کی سختی کے بجائے ان کے ہاں وحدت الوجود کا تصور تھا جس میں ہر فرقہ اور مذہب کے لوگوں کو برداشت کرنے کا جذبہ تھا۔ ہندوستان کے ماحول میں جہاں ہندو اور مسلمان دونوں اکٹھے رہتے تھے وہاں نچلے طبقے میں صوفیا کے سلسلے مقبول ہوئے کیونکہ انہوں نے آپس میں میل جول اور اشتراک کی حمایت کرتے ہوئے انہیں مذہبی جواز دیا۔

اس ردعمل کے طور پر عہد مغلیہ میں نقشبندی سلسلہ شروع ہوا، اس نے "صلح کل" "وحدت الوجود" اور شریعت کے معاملات میں لچک کی مخالفت کرتے ہوئے صوفیاء نے ان سلسلوں کی مخالفت کی اور وحدت الشہود کے نظریہ کے تحت مسلمانوں کی علیحدگی پر زور دیا اس سلسلہ کو احمد سرہندی اور ان کے پیرو کاروں نے ہندوستان میں مستحکم کیا۔ اس سلسلہ کی حمایت کرنے والے خصوصیت سے مغل عہد کے سنی امراء تھے. جن کے سیاسی مفادات کو اس سے مدد ملتی تھی۔

علماء کے تشدد کے ردعمل کے طور پر شطاریہ، مداریہ، اور قلندر و مجذوب پیدا ہوئے. یہ شریعت کی ظاہری پابندیوں کے خلاف تھے اور علانیہ اس کی مخالفت اور خلاف

ورزی کرتے تھے۔ ان کے نزدیک زندگی کو شریعت کی پابندیوں میں جکڑ کر بہتر نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ اس لئے یہ مذہبی اور دنیاوی پابندیوں سے خود کو آزاد رکھتے تھے۔ ان میں ہر مذہب اور فرقہ کے لوگ شامل تھے۔ ان کے آزادانہ رویہ کی وجہ سے علماء اور حکومت انہیں جہالت و گمراہی میں مبتلا سمجھتے تھے. مگر حکومت کو ان سے کسی قسم کا سیاسی خطرہ نہیں تھا، اس لئے وہ ان سے چشم پوشی کرتے تھے۔

صوفیاء کے مقبول ہونے کی وجہ یہ تھی کہ علماء کا رویہ عوام کے ساتھ رعونت اور تشدد کا تھا، وہ حکومت کا ایک حصہ ہوتے ہوئے صاحب اقتدار تھے اور ان کے تعلقات بھی امراء اور اعلیٰ طبقوں سے تھے. غیر مسلموں کے ساتھ ان کا رویہ انتہائی سخت تھا اور وہ انہیں کافر و مشرک قرار دے کر انہیں واجب القتل سمجھتے تھے. اور ان سے کسی بھی قسم کے سماجی اور تعلقات کے خلاف تھے۔

علماء کے مقابلہ میں صوفیوں کے ہاں قوت برداشت تھی. ہندوؤں اور مسلمانوں کو خدا کی مخلوق سمجھ کر ان سے ہمدردی کرتے تھے اور بادشاہوں کو بھی یہی مشورہ دیتے تھے کہ رعیت کے ساتھ بہتر سلوک کرو. چنانچہ شیخ محب اللہ الہ آبادی (وفات ۱۶۴۸ء) نے شاہ جہاں سے کہا تھا کہ ہندو اور مسلمان خدا کی مخلوق ہیں، اس لئے بادشاہ کو چاہئے کہ وہ رعیت کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ (۱)

اکثر صوفیاء نے سمع. موسیقی اور رقص کو اختیار کیا. جس نے زندگی میں ٹھہراؤ کی جگہ حرکت پیدا کی. اور خشکی کی جگہ رنگینی آ گئی۔ سمع کے دوران موسیقی اور اشعار سامعین کو متاثر کرتے تھے اور ان میں وارفتگی کے جذبات پیدا کرتے تھے۔ موسیقی اور رقص نے صوفیاء کی خانقاہوں کو مقبول بنانے میں بڑی مدد دی۔

— ۱ —

ہندوستان کے سیاسی و سماجی ماحول میں صوفیاء نے عوام کی ضروریات کو پورا کیا اور ان کو وہ حالات ملے جنہوں نے ان کو ہندوستان میں مقبول بنایا۔ مثلاً جب

یہاں مقامی لوگ مسلمان ہوئے تو تبدیلی مذہب نے ان کی زندگی میں ایک خلا پیدا کر دیا. کیونکہ اسلام میں خدا کا جو تصور ہے اس میں کوئی شکل و صورت نہیں جو نظروں کے سامنے ہو اور جس سے مرادیں مانگی جا سکیں. اس لئے اس کا نعم البدل عوام کو صوفیاء کی شکل میں ملا. جن کے بارے میں ان کے مریدوں نے کرامتوں کے قصے اور کہانیاں پھیلا رکھی تھیں اور جس کی وجہ سے پیر کی شخصیت عام انسانوں کے مقابلہ میں بلند و بالا اور مافوق الفطرت ہو گئی تھی، یہ مافوق الفطرت شخصیت نہ صرف انسانی خواہشوں کو پورا کرتی تھی، بلکہ انہیں بیماریوں سے بھی نجات دلاتی تھی، اس کے علاوہ یہ خدا اور بندوں کے درمیان واسطہ اور وسیلہ کا بھی کام سرانجام دیتی تھی۔

اس لئے ایک ایسے معاشرہ میں جہاں لاتعداد اقتصادی اور سماجی مسائل ہوں. جہاں طرح طرح کی بیماریاں ہوں اور ان کا موثر و کامیاب علاج نہ ہو. جہاں محرومیوں کی بہتات ہو اور ان کی تسکین کا کوئی ذریعہ نہ ہو. تو ایسی صورت میں لوگ ان غیر فطری طریقوں پر ایمان لے آتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ صوفیاء کی خانقاہیں نچلے طبقوں کے عوام کے لئے مرادیں پانے کا مرکز بن گئیں۔

ایک دوسرا سبب یہ بھی ہوا کہ تبدیلی مذہب کے بعد نچلی ذات کے لوگوں کو اسلامی معاشرہ میں مساوی مقام نہیں ملا۔ اس کا ان پر زبردست اثر ہوا کیوں کہ ایک طرف تو انہوں نے اپنا مذہب چھوڑا اور اپنی ذات برادری سے نکالے گئے تو دوسری طرف مسلمانوں کے معاشرے میں ان کو برابری کا درجہ بھی نہیں دیا گیا۔ اس لئے صوفیاء کی خانقاہوں میں جہاں ان کو بازیابی کے مواقع ملے اور ان کے سلسلہ میں شامل ہونے کے بعد ایک طرح سے برادری شامل ہو گئے. اس نے ان کی سماجی ضرورت کو پورا کیا اور ان کی سماجی محرومی ایک حد تک پوری ہو گئی۔

— ۲ —

ہندوستان کے سیاسی حالات میں خانقاہ نے عوام کی ضروریات کو بھی پورا کیا، کیونکہ

عوام بادشاہ اور انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیداروں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے تھے اور خانقاہوں میں امراء اور انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیدار بھی آیا کرتے تھے، اس لئے لوگ اس امید میں بھی وہاں جاتے تھے کہ اس وسیلہ سے وہ اپنی بات ان تک پہنچا سکیں گے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکیں گے۔

لوگ صوفیوں کے ذریعہ اپنی عرضیاں بادشاہ اور امراء تک پہنچاتے تھے چنانچہ شیخ رکن الدین ابوالفتح جو سہروردی سلسلہ سے تھے۔ جب دربار جاتے تو ضرورت مند راستہ میں آپ کو عرضیاں دیتے جاتے اور آپ کی پالکی عرضیوں سے بھر جاتی۔ آپ نے خادم کو ہدایت کر رکھی تھی کہ عرضیاں بادشاہ کے سامنے رکھے تاکہ وہ اپنی موجودگی میں ان پر موافق حکم لکھوا سکیں۔ (۲) مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے بارے میں بھی ہے کہ وہ ضرورت مندوں کی درخواستیں فیروز شاہ تغلق تک پہنچاتے تھے (۳) خاص طور سے مغلوں کے زمانہ میں صوفیوں کے دربار سے اچھے تعلقات تھے اور وہ لوگوں کی شکایتیں بادشاہ تک پہنچاتے تھے۔ (۴) اس کی وجہ سے صوفیاء عوام میں مقبول ہوئے اور ان کی خانقاہوں میں ضرورت مندوں کا مجمع رہنے لگا۔

اگر کسی صوفی کا معتقد کوئی بادشاہ شہزادہ یا کوئی بڑا امیر ہو جاتا تو اس صورت میں اس کے مریدوں کی تعداد بھی بڑھ جاتی تھی۔ کیونکہ مرید بھائی ہونے کی حیثیت سے لوگ اس سے اپنے کام کرا سکتے تھے اور اس ذریعہ سے اپنے لئے ملازمتیں اور دیگر مراعات حاصل کر سکتے تھے اس کی مثال احمد سرہندی کے خطوط میں جن میں انہوں نے اپنے معتقد امراء، کو اپنے مریدوں کے کام کے لئے لکھا ہے۔

—۳—

ہندوستان میں خانقاہ ایک ایسا ادارہ بن گئی تھی جس میں پیر اور صوفی کے ماننے والے اور عقیدت مند حکمران اور امراء عطیات دیا کرتے تھے اور اس طرح ان کی خوشنوذی کے ذریعہ خدا کی خوشنودی حاصل کیا کرتے تھے۔ اس کے لئے خانقاہ میں ہر روز

نذر، نیاز، تحفے اور فتوحات کثرت سے آتی تھیں۔ چونکہ اکثر خانقاہوں میں یہ دستور تھا کہ وہ نقدی اور تحفہ تحائف ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کر دیتے تھے اس لئے یہاں حاجت مندوں اور مفلسوں کا ایک ہجوم رہتا تھا کہ شاید انہیں عطیات میں سے کچھ مل جائے اس داد و دہش کی وجہ سے خانقاہ کے شیخ کی عزت اور بڑھ جاتی تھی اور وہ غریبوں کے لئے فیاض و داتا بن کر ابھرتا تھا۔

اس کے علاوہ ہر خانقاہ میں رہائش کا بھی انتظام ہوتا تھا، اور لنگر بھی جاری رہتا تھا۔ اس لئے وہ تمام غریب و مفلس اور بے کار لوگ جن کا مقدر بھوک اور فاقہ تھا ان کے لئے یہ خانقاہیں روٹی حاصل کرنے اور سر چھپانے کا ذریعہ بن گئیں اس لئے ایک ایسی جگہ جہاں دو وقت کا کھانا مل جائے رہنے کو جگہ مل جائے اور عطیات میں سے کچھ نقدی مل جائے ایسی جگہ محروم لوگوں کے لئے ایک نعمت سے کم نہ تھی۔ مثلاً نظام الدین اولیا" کے بارے میں ہے کہ آپ کے ہاں ہر روز ہزاروں کی نذر نیاز آئی مگر آپ اسے فوراً خرچ کر دیتے اور آپ کے دروازے سے کوئی مایوس نہیں جاتا۔ تین ہزار علماء و فضلاء علاوہ طالب علموں اور حافظوں کے اور دو سو قوال ہمیشہ آپ کی سرکار میں پرورش پاتے تھے (۶)

اسی طرح دوسرے سلسلہ میں صوفیوں کے ہاں رہائش اور لنگر کی سہولتیں تھیں، جو غریب اور بے کار عوام کو رزق فراہم کرتی تھیں اور لوگ ایک خانقاہ سے دوسری خانقاہ میں آتے جاتے رہتے تھے اور اسی طرح اپنی زندگی گزار دیتے تھے۔

خود صوفیاء میں اکثر کے حکمرانوں سے تعلقات تھے جس کی وجہ سے انہوں نے دولت مندی اور خوشحالی کی زندگی گزاری، جیسے شیخ گیسو دراز، اور شیخ احمد کھٹو (۷)

— ۴ —

صوفیاء نے ہمیشہ حکمران طبقوں سے مفاہمت کی اور کبھی حکومت وقت کی مخالفت نہیں کی اور نہ ہی انہوں نے سیاسی نظام اور حکومتی اداروں میں کسی تبدیلی کے لئے کوئی

تحریک چلائی بلکہ ہر سیاسی تبدیلی کو انہوں نے خاموشی سے تسلیم کر لیا اور ہر امیدوار کو جس نے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا اسے جائز حکمران تسلیم کر لیا نظام الدین اولیاؒ جنہوں نے کئی حکمران خاندانوں کی تبدیلی کو دیکھا. کبھی خود کو سیاست میں ملوث نہیں کیا اور علاؤ الدین خلجی اور خسرو خان دونوں کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔

چونکہ صوفیاء نے اس حقیقت کا ادراک کر لیا تھا کہ وہ اپنے سلسلہ اور خانقاہ کو اسی وقت محفوظ رکھ سکتے ہیں جب کہ وہ موجودہ برقرار سیاسی نظام کو تسلیم کر لیں اور اس میں کسی تبدیلی کے خواہش مند نہ ہوں. اس لحاظ سے صوفیاء نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ سیاسی نظام اور حکمران طبقوں کو فائدہ پہنچایا. کیونکہ ان کے پاس نچلے طبقوں کے محروم لوگ خواہشات و تمناؤں کے ساتھ آتے تھے اور اپنی معاشی و سماجی ناآسودگی کا حل چاہتے تھے اور وہ اس کا علاج ترک دنیا. توکل. قناعت. صبر. عبادت. چلہ کشی مراقبہ اور ذکر میں بتاتے تھے۔ اس میں یہ ایک طرف مرید کے دل میں دنیا سے نفرت پیدا کرتے تھے اور اس کے روحانی درجوں کو بلند کرنے میں اسے مصروف رکھتے تھے تو دوسری طرف معاشرہ میں ہونے والی ناانصافیوں. ظلم و ستم اور اذیتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ دیتے تھے اور اس میں ظلم کے خلاف مزاحمت کے جو بھی جذبات ہوتے تھے انہیں اس ذریعہ سے دبا دیا جاتا تھا۔

نہ ہی یہ صوفیا اپنی تعلیمات سے معاشرہ کے سماجی حالات کو بدل سکے. اور معاشرہ میں ذات پات اور اشراف و اجلاف کا جو فرق تھا وہ اسے مٹا سکے اور معاشرہ میں سماجی اونچ نیچ برتری و کمتری اسی طرح سے قائم رہی۔

اس وجہ سے ان کے ماننے والوں نے حالات کو جیسے کہ وہ تھے اسی طرح سے تسلیم کر لیا اور ان میں کسی قسم کی ردو بدل اور تبدیل کی ضرورت محسوس نہیں کی محرومیوں کی آگ میں جلنے والوں کو روحانیت کا ایسا ٹھنڈا سکوں ملا کہ انہوں نے بغاوت. مزاحمت، جدوجہد اور مقابلہ کے تمام خیالات کو دل سے نکال دیا اور حالات پر راضی بہ رضا اور تقدیر کے ہاتھوں خوشی سے گرفتار ہو گئے۔

اس لئے صوفیاء ان کی تعلیمات اور خانقاہیں حکومت کے لئے اور حکمران طبقوں کے

لئے زبردست سہارا بن گئیں اسی لئے انھوں نے ان کی سرپرستی کی اور ان کو مالی امداد دی جس کی مدد سے یہ لنگر چلاتے تھے اور لوگوں میں خیرات و صدقات دیتے تھے اس سے شیخ اور ان کے مریدوں کی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔

صوفیاء نے اور ان کی خانقاہوں نے ہندوستان میں مسلمان معاشرہ کے جمود کو اور بڑھایا اور تبدیلی کے تمام جذبات کو سرد و ٹھنڈا کر دیا۔

حوالہ جات

۱۔ شیخ محمد اکرام: رود کوثر ص۔ ۴۴۱

۲۔ آب کوثر: ص ۳۶۵ - ۳۶۶

۳۔ ایضاً: ۳۸۰

۴۔ ایم مجیب: ص۔ ۳۱۰

۵۔ ایضاً ص۔ ۲۹۰

مسلمان عہد برطانیہ میں

مغل زوال کے وقت تک ہندوستان میں مسلمان معاشرے کی ہیئت و ساخت اپنی جگہ جامد ہو چکی تھی، حکومتی ادارے۔ سیاسی نظام۔ ثقافتی و سماجی روایات حکومتوں کے بدلنے، حکمران خاندانوں کی تبدیلی، اور سیاسی ٹوٹ پھوٹ سے متاثر ضرور ہوئیں، مگر ان کی بنیادیں اپنی جگہ رہیں۔ آخری عہد مغلیہ میں جب کہ ہندوستان کی دوسری اقوام مثلاً مراہٹہ، جاٹ۔ راجپوت اور سکھ سیاسی طور پر طاقتور ہو رہے تھے۔ لیکن یہ چیلنج بھی مسلمان معاشرے کے جمود کو نہیں توڑ سکا اور انہوں نے اس ڈھانچہ کو جوں کا توں رہنے دیا جو انہیں وراثت میں ملا تھا۔ بادشاہ سے وفاداری۔ امراء کی مراعات۔ خاندان کا تصور۔ ذات پات کا فرق، عورت کی کمتر حیثیت۔ مذہبی عقائد و خیالات شہر و دیہات کی ثقافت کا فرق، مختلف طبقوں کے درمیان معاشی و ثقافتی تضاد۔ پیر پرستی و توہمات پر اعتقاد غرض ہر چیز اسی طرح سے اپنی جگہ قائم رہی، ذہنی و فکری لحاظ سے معاشرہ ایک جگہ تھم کر رہ گیا۔ اس میں نہ تو بدلنے کی خواہش تھی۔ نہ نئی چیز کو اختیار کرنے کا حوصلہ اور آگے بڑھنے کی جرات۔ وہ بوسیدہ و خستہ و کمزور روایات کو سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔

ان حالات میں اہل برطانیہ نے ہندوستان میں سیاسی اقتدار حاصل کیا۔ ابتدا میں انہوں نے معاشرے کی ساخت میں کوئی زیادہ تبدیلی نہیں کی۔ مگر برطانیہ کوئی مقامی طاقت نہیں تھی یہ ایک غیر ملکی طاقت تھی اور ان کے ملک کے حالات ہندوستان سے مختلف تھے، اس کے علاوہ ان کا مقصد صرف اقتدار ہی حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ بنیادی طور پر وہ اقتصادی ذرائع کا استحصال کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے جب ان کے سیاسی اقتدار کی بنیادیں مضبوط ہوئیں تو انہیں اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ وہ حکومت کے ڈھانچہ اور ہندوستان کے

معاشرے کی ساخت کو تبدیل کریں۔

غیر ملکی طاقت اور ایک مختلف نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی سیاسی برتری کے لئے اور اپنے اقتدار کے لئے کوئی جواز تلاش کریں۔ اس لئے انہوں نے یہاں کی تہذیب و ثقافت پر حملے شروع کئے کہ جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ اہل ہندوستان غیر مہذب اور صلاحیت سے محروم لوگ ہیں اور صدیوں کی مطلق العنان حکومتوں نے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ اس لئے یہ ان کا مقدر ہے کہ یہ محکوم بن کر رہیں۔ یہ ہندوستان کے لئے باعث رحمت ہے کہ یہاں انگریزوں کی حکومت قائم ہو گئی اور انہیں پوری تہذیب کی نعمتوں سے مالا مال ہونے کا موقع مل گیا۔

اس ضمن میں مسلمان معاشرہ خاص طور سے ان کے ثقافتی حملوں کی زد میں آیا۔ یہ پہلا موقع تھا مسلمان معاشرہ پر داخلی حملے کے بجائے خارجی حملہ ہوا اور اس کے نتیجہ میں ان کا پورا دور حکومت مطلق العنانیت و وحشت و بربریت کا مرقع بن کر رہ گیا اور ان کا مذہب جدید زمانہ کے رجحانات کی روشنی میں قدیم و متروک روایات کا مجموعہ ثابت ہوا اور ان کی تمام تہذیبی و ثقافتی روایات انتہائی فرسودہ ثابت ہوئیں۔ انگریزوں نے جب مسلمان ریاستوں پر قبضہ کیا اور شاہی خاندانوں کو اقتدار سے محروم کیا. امراء و جاگیرداروں کی زمینیں چھینیں، ان کے عہدے و ملازمتیں ختم کیں. ان کی سماجی و مذہبی زندگی میں دخل دیا. وراثت و شادی بیاہ کے قوانین میں تبدیلی کی، ریونیو کا طریقہ بدلا. عدالتی انتظام نیا شروع کیا، تعلیمی نظام میں بنیادی تبدیلیاں لائے اور انتظامیہ کا پورا ڈھانچہ بدل دیا تو اس نے معاشرے کے جمود کو توڑ کر اسے بالکل الٹ پلٹ دیا۔

انگریزی دور اور انگریزی ثقافت کا ردعمل ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف انداز سے ہوا۔ جنوبی ہندوستان میں مسلمان تاجر پیشہ تھے اور ان کا تعلق عرب کے تاجروں سے تھا جو ابتدائی زمانہ میں یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ تاجر ہونے کے لحاظ سے ان کے رویہ میں لچک تھی اور حالات سے سمجھوتہ کرنے کا جذبہ، اس لئے انہوں نے اس نئی تبدیلی کو تسلیم کر لیا اور انگریزی اقتدار میں رہتے ہوئے ان کی زبان بھی سیکھنی شروع کر دی۔ (۱)

شمالی ہندوستان میں جہاں مسلمان جاگیردارانہ نظام کے سب سے بڑے ستون تھے اور جن کا تعلق فاتحین کی نسل سے تھا. انہوں نے انگریزی اقتدار کو خوشی سے تسلیم نہیں کیا. چونکہ ان میں مزاحمت کی طاقت مفقود تھی اس لئے یہ لوگ سمٹ کر خاموشی سے ایک خول میں بند ہو گئے اور نئی تبدیلیوں سے آنکھیں بند کر لیں اور ہر نئی چیز سے ان میں نفرت پیدا ہو گئی۔ یہ ایک شکست خوردہ معاشرہ کا انتہائی فرسودہ ردعمل تھا۔ انہوں نے تبدیل ہوتے ہوئے حالات کو سمجھنے کے بجائے اسے نظرانداز کر دیا۔

— ۱ —

انگریزی اقتدار کے اثرات مسلمانوں کے ہر طبقہ پر مختلف ہوئے، ان سے وہ لوگ بھی متاثر ہوئے جن کا تعلق نچلے طبقوں سے تھا. اور جن کا روزگار حکمران طبقوں سے وابستہ تھا۔ جب ہندوستان کی خود مختار مسلمان ریاستیں ختم ہوئیں تو اس نے مسلمان سپاہیوں کو بیروزگار کر دیا، مسلمانوں کی اکثریت کا تعلق فوج سے ہوا کرتا تھا. اور فوج ختم ہونے کے بعد انہوں نے دوسرے پیشوں کو اختیار کرنا عزت کے خلاف سمجھا. اس لئے تلاش معاش میں یہ پورے ہندوستان میں بکھر گئے. اور ان ریاستوں کی طرف رخ کیا جو اب تک باقی تھیں، اس ہجرت کے عمل نے ان کی جڑوں کو اور کمزور کر دیا اور ایک جگہ مستقل نہ رہنے کی وجہ سے خاندان کے خاندان ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

بنگال میں نئی تبدیلی سے وہاں کا مسلمان جاگیردار طبقہ متاثر ہوا، کیونکہ برطانوی حکومت نے مسلمان جاگیرداروں کو ہٹا کر براہ راست ہندو کسانوں سے رابطہ قائم کیا جس کی وجہ سے یہ خاندان آن واحد میں مفلس ہو کر رہ گئے۔

بنگال میں دوسرا متاثر ہونے والا طبقہ مسلمان کاریگروں کا تھا. جو چھوٹی صنعتوں کے ذریعہ اپنے خاندانوں کی کفالت کرتے تھے، برطانیہ کی صنعتی ایجادات اور ترقی نے ان کاریگروں کو بیروزگار کر دیا اور ان کا خاندانی فن نئے حالات میں تباہ ہو گیا۔

مجموعی طور پر انگریزی اقتدار نے طبقہ اعلیٰ کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا،

کیونکہ اپنی حکومت کی وجہ سے ان میں احساس تحفظ تھا، ان کی تہذیبی اور ثقافتی روایات کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی، اقتدار سے محرومی نے انہیں خلا میں معلق کر دیا اور انہیں احساس ہوا کہ وہ ہندو اکثریت اور برطانوی اقتدار کے درمیان بے سہارا اور بے آسرا ہو کر رہ گئے ہیں۔

اس تبدیلی سے علماء کا طبقہ بھی متاثر ہوا، کیونکہ اب تک حکومت کی سرپرستی میں انہیں عہدے و منصب و مراعات ملی ہوئی تھیں، جب برطانیہ کا سیکولر قانون آیا تو علماء جو بحیثیت صدر، مفتی اور قاضی کے ملازم تھے، برطرف کر دیئے گئے، اس نے ان کے طبقہ کو بے کار کر کے رکھ دیا، جب وہ حکومت کی سرپرستی سے محروم ہوئے تو ان کے لئے سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں تھا کہ اب وہ اپنا رشتہ عوام سے جوڑ لیں، کیونکہ اب عوام ہی کے ذریعہ وہ اپنی آمدنی کے وسائل پیدا کر سکتے تھے۔ اس نے ان کا اقتدار گھٹا کر مدرسوں میں محدود کر دیا اور ان کے فرائض یہ رہ گئے کہ وہ مسئلہ مسائل بتاتے رہیں۔

— ۲ —

علماء نے اس محرومی کا اظہار اصلاح مذہب اور احیائے اسلام کی تحریکوں کے ذریعہ کیا، ایک طرف تو انہوں نے انگریزی اقتدار کو عیسائی اقتدار کہہ کر اور انگریزی نظام تعلیم کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف انہوں نے مسلمانوں کے معاشرے کو خالص بنانے کے لئے ہندو رسومات کے خلاف جہاد کیا کیونکہ ان کے نزدیک خالص اسلامی روایات کے نفاذ کے بعد ہی وہ اس قابل ہو سکتے تھے کہ دوبارہ سے سیاسی اقتدار قائم کریں۔ ان تحریکوں کی خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے خالص اور ابتدائی عربی اسلام کے احیاء کا نعرہ بلند کیا، اور ایک بار پھر اس بات کا اعادہ کیا کہ ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ اسے رہائش کی جگہ تصور کرنا چاہئے (۲) اس لئے علماء نے بنیادی طور پر اس مسئلہ کو اٹھایا کہ کیا ہندوستان دارالامان ہے یا دارالحرب؟ اس پر ہندوستان کے بڑے بڑے علماء کا یہ فیصلہ تھا کہ یہ ملک اب دارالحرب ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں شاہ عبدالعزیز اور مولوی عبدالحئی کے

خطرہ میں پڑ گئی تھی اور ان تحریکوں نے عام مسلمان کو اکسایا تھا اور بغاوت پر آمادہ کیا تھا خصوصیت سے فرائضی تحریک جس کی شکل عوامی تھی اور وہ عوامی حقوق کے لئے لڑ رہے تھے۔ اس لئے اونچے طبقوں کے مفاد میں نہیں تھا کہ مسلمان مزاحمت کو اختیار کریں۔ اس لئے اول مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلایا گیا کہ ہندوستان دارالحرب نہیں دارالامان ہے، مولوی کرامت علی جو بنگال کے رہنے والے تھے انہوں نے یہ دلیل دی کہ چونکہ ہندوستان میں مسلم پرسنل لا برقرار ہے اس لئے یہاں جہاد فرض نہیں۔ سرسید نے کہا کہ مسلمان ہندوستان میں امن میں رہ رہے ہیں اور انہیں مذہبی آزادی حاصل ہے اس لئے جہاد فرض نہیں۔ ہندوستان نہ تو دارالحرب ہے اور نہ دارالامان. بلکہ دونوں کے درمیان ہے۔ مولوی چراغ علی نے کہا کہ ہندوستان نہ تو دارالحرب ہے نہ دارالامان بلکہ یہ برطانوی ہندوستان ہے۔ اس لئے بدلتے ہوئے حالات میں یہ بحث ہی فضول ہے۔ (۹)

اس کے ساتھ ہی سرسید نے اس بات کی کوشش کی کہ سیاسی، تعلیمی، ثقافتی، اور مذہبی شعبوں میں مسلمانوں اور انگریزوں میں مفاہمت اور تعاون پیدا کیا جائے۔ اس وقت یہ مسلمان امراء اور جاگیردار طبقوں کی ضرورت بن گئی تھی جو بدلے ہوئے حالات میں اپنی ساکھ اور وقار کو دوبارہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کی راہ میں جو رکاوٹیں تھیں انہیں سرسید اور ان کے ساتھیوں نے بڑی خوبی اور عمدگی کے ساتھ دور کیا۔ چنانچہ سرسید نے پہلی مرتبہ مذہب کا ترقی پسند نظریہ پیش کیا ورنہ اب تک مذہب میں صرف احیاء کی باتیں کی جاتی تھیں اور اسلام کو غیر اسلامی روایات و عقائد سے پاک صاف کرنے پر زور دیا جاتا تھا۔ اور اس مثالی معاشرہ کو قائم کرنے کی بات کی جاتی تھی جو ابتدائی اسلامی دور میں قائم ہوا تھا۔ اس کے برعکس اب جب کہ اس کا سابقہ مغرب سے پڑا اور یہ یورپ کی سیاسی وثقافتی و سائنس و فنی ترقی سے دوچار ہوئے تو اس کے مقابلہ میں انہیں اپنا معاشرہ بڑا پس ماندہ نظر آیا اور ساتھ ہی شدت کے ساتھ یہ سوال ابھرا کہ کیا اس پس ماندگی کا سبب مذہب ہے؟ سرسید اور ان کے ساتھیوں نے یہ نہیں کہا کہ احیاء کے ذریعہ خالص اسلام کو معاشرہ میں نافذ کیا جائے اور اس میں سے غیر اسلامی روایات کو نکال دیا جائے بلکہ انہوں نے اس موقف کو

اختیار کیا کہ مذہب اسلام ایک وسیع اور ہمہ گیر مذہب ہے اور اس میں سیاسی ثقافتی اور سائنسی تبدیلیوں کو ضم کرنے کی گنجائش ہے۔ اسلام جدیدیت کا مخالف نہیں بلکہ اس کا حامی ہے۔ جدید نظریات کا اسلام سے تضاد نہیں بلکہ یہ عین اسلام ہے اس لئے انہوں نے قرآن کی تفسیر میں اس بات کی کوشش کی کہ علماء قدیم کے مقابلہ میں نئی اور جدید سائنسی و ثقافتی اصلاحات کے ذریعہ تشریح کی جائے۔ انہوں نے ان اعتراضات کا بھی جواب دیا جو اسلام اور مسلمانوں پر یورپ کے علماء و مفکرین کر رہے تھے۔ اس طرح انہوں نے اسلام میں ترقی پسندی کے نظریہ کو ہندوستان میں روشناس کرایا جسے مولوی چراغ علی اور امیر علی نے بعد میں اور آگے بڑھایا۔

سرسید نے انگریزی حکومت سے مفاہمت کی غرض سے اس بات کی بھی کوشش کہ ہندوستان کے مسلمان صرف اپنے مفادات کے بارے میں سوچیں اور ہندوستان سے باہر عالم اسلام، پان اسلام ازم اور امت مسلمہ سے کوئی تعلق نہیں رکھیں اس مقصد کے تحت انہوں نے خلافت کے ادارے پر مضمون لکھا اور یہ ثابت کیا کہ خلافت وقت کے ساتھ ختم ہو چکی ہے اور خلیفہ دنیا کے تمام مسلمانوں کا سربراہ نہیں ہے اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یہ قطعی ضروری نہیں کہ وہ خلیفہ کو سربراہ مانیں بلکہ ہندوستان میں رہتے ہوئے اپنے مفادات کے لئے برطانوی حکومت سے تعاون کریں۔

سرسید نے اس چیز کو بھی محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کے مدرسوں اور تعلیمی اداروں میں صرف مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ پڑھائی جاتی ہے اور طالب علم ہندوستان کی تاریخ سے بے خبر رہتے ہیں اس لئے انہوں نے ہندوستان کی تاریخ میں دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے منہاج سراج کی طبقات ناصری. ابو الفضل کی آئین اکبری اور جہاں گیر کی توزک جہانگیری کو ایڈٹ کر کے طبع کرایا۔ ان کی اپنی کتاب آثار الصنادید کو بھی اس میں شامل کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں دہلی کی تاریخی عمارتوں کا ذکر ہے۔

سرسید کی تحریک نے مسلمان شرفاء، امراء اور جاگیردار طبقے کو پس ماندگی سے نکال کر جدید مغربی تعلیم سے روشناس کرایا اور انگریزوں کے ساتھ وفادار رکھنے کے لئے انہیں

فتویٰ مشہور ہے۔ شاہ عبدالعزیز اپنے فتویٰ میں لکھتے ہیں کہ:

"جب کافر کسی اسلامی ملک پر قابض ہو جائیں اور اس ملک اور ملحقہ اضلاع کے لئے یہ ناممکن ہو کہ وہ ان کو اس سے باہر نکال سکیں، یا ان کو باہر نکالنے کی امید باقی نہ رہے اور کافروں کی طاقت میں یہاں تک اضافہ ہو جائے کہ وہ اپنی مرضی سے اسلامی قوانین کو جائز یا ناجائز قرار دیں اور کوئی اتنا طاقتور نہ ہو جو کافروں کی مرضی کے بغیر ملک کی مال گزاری پر قبضہ کر سکے اور مسلمان باشندے اس میں امن و امان سے زندگی بسر نہ کر سکیں جیسا کہ وہ پہلے کرتے تھے۔ تو یہ ملک سیاسی اعتبار سے دارالحرب ہو جائے گا" (۳)

مولوی عبدالحئ اپنے فتویٰ میں کہتے ہیں کہ:

"عیسائیوں کی پوری سلطنت کلکتہ سے لے کر دہلی اور ہندوستان خاص سے ملحقہ ممالک (یعنی شمالی مغربی سرحد) تک سب کی سب دارالحرب ہے کیوں کہ کفر اور شرک ہر جگہ رواج پا چکا ہے اور ہمارے شرعی قوانین کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ جس ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں وہ ــــ دارالحرب ہے" (۴)

علماء کی ایک اقلیت نے اس خیال سے کہ ہندوستان دارالحرب ہے، ہجرت کر کے حجاز میں رہائش اختیار کر لی اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ انہوں نے ہندوستان سے آنے والے طالب علموں اور علماء کو اپنے قدامت پرستانہ خیالات سے مسلسل متاثر کیا۔

ان فتووں سے ہندوستان میں غیر ملکی مسلمانوں کے ذہن کی پوری پوری عکاسی ہوتی ہے کہ وہ ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے رہائش گاہ خیال کرتے تھے۔ اور صدیاں گزرنے کے باوجود ان کے ذہنوں میں اپنی آبائی وطن کی واپسی کا تصور موجود تھا، جب تک سیاسی اقتدار رہا یہ جذبہ دبا رہا مگر احساس محرومی نے ایک بار پھر ان کی جڑیں ہندوستان سے اکھیڑ دیں اور ان میں مشرک و کافرانہ معاشرہ سے دور وطن جانے کی شدید

خواہش پیدا ہو گئی اس زمرے میں وہ مقامی ہندوستانی مسلمانوں کو بھول گئے اور صرف ان لوگوں کی بات کی جو ہجرت کر کے اس ملک میں آئے تھے اور جو خالص عربی ثقافت کے لئے عرب جانا چاہتے تھے یا اعلیٰ و برتر ثقافتی روایات کے تحفظ کے لئے وسط ایشیا و ایران میں پناہ لینا چاہتے تھے، ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے کے فتویٰ نے حالات سے مقابلہ کرنے کے بجائے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

ان علماء کے تاریخی شعور کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے دور کو اسلامی عہد سمجھتے تھے اور اس حقیقت کا ادراک نہیں کیا کہ یہ مسلمان حکمران خود جب شریعت سے ان کے مفادات ٹکراتے تھے تو وہ اس سے روگردانی کرتے تھے اور اسے پس پشت ڈال دیتے تھے۔

ان فتوؤں کے بہ موجب جب ہندوستان دارالحرب قرار پایا تو اس صورت میں ہر مسلمان کے لئے یہ لازمی ہوا کہ جہاد کے ذریعہ ان حالات کو ختم کرے جو اس ملک کو دارالحرب بنائے ہوئے ہیں۔ چونکہ ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی امام نہیں تھا اور نہ ان کی سیاسی تنظیم تھی اس لئے اس فیصلہ کا اختیار مسلمانوں کے انفرادی مفادات پر تھا. وہ لوگ جنہیں برطانوی اقتدار سے فائدہ پہنچا تھا انہوں نے اسے دارالسلام یا دارالامان سمجھا اور جنہیں نقصان ہوا تھا انہوں نے اسے دارالحرب قرار دیا ان میں خصوصیت سے فرائضی تحریک اور سید احمد بریلوی کی جہاد تحریک تھی۔ ان کی دلیل کے مطابق صرف مسلمانوں کے اکثریتی ملک میں یا اس ملک میں جہاں مسلمان حکمران کی حکومت ہو مسلمان اپنے مذہبی امور پورے کر سکتے ہیں۔ اس لئے یا تو اسلامی حکومت کے قیام کے لئے جہاد کرنا چاہئے یا ملک سے ہجرت کرنا چاہئے۔

_۳_

ان حالات میں سید احمد شہید (۱۸۳۱_۱۸۸۶) نے جب جہاد کی تحریک شروع کی تو حالات ان کے موافق تھے کیونکہ اٹھارہویں صدی کے شروع میں مسلمان معاشرے کے ہر

طبقہ میں چاہے وہ جاگیردار ہو یا نچلے درجہ کا دستکار و کاریگر اور کسان و کاشتکار ان سب میں ذہنی انتشار اور بے چینی تھی اور ان کی ٹھہری ہوئی زندگی میں جو ہلچل پیدا ہوئی تھی اس نے انہیں پریشان و فکر مند کر دیا تھا۔ سیاسی اقتدار سے محرومی اور معاشی بدحالی نے ہر طبقہ کو متاثر کیا۔ برطانوی اقتدار اور اس کی فوجی طاقت و قوت کے سامنے وہ خود کو بے بس اور مجبور پاتے تھے۔ جو مسلمان ریاستیں باقی بچی تھیں انہوں نے برطانوی اقتدار کو تسلیم کر لیا تھا اس لئے ان کے لئے مزاحمت کے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ اس خلا کو سید احمد شہید کی تحریک نے پورا کیا کیوں کہ ان کے لئے صرف ایک صورت تھی کہ روحانی قوت و طاقت کے حصول کے ذریعہ وہ ایک بار پھر سیاسی طاقت اور مادی وسائل کو حاصل کریں۔ اس لئے وہ علماء بھی جو علم و فضل میں سید احمد شہید سے بڑھے ہوئے تھے وہ ان کے مرید ہو گئے اور یہ امید کرنے لگے کہ ان کی روحانی طاقت مسلمان معاشرے میں انقلاب لے کر آئے گی۔

سید احمد شہید نے یہ فیصلہ کیا کہ جہاد کی ابتداء برطانوی ہندوستان سے نہ کی جائے فنی اعتبار سے انہوں نے جو فتوی دیا وہ یہ تھا کہ خلیفہ اور امام کی غیر موجودگی میں جہاد کا اعلان نہیں ہو سکتا اس لئے دارالحرب میں جنگ بغاوت ہو گی. اس کے مقابلہ میں سرحد کا علاقہ دارالامان ہے اس وجہ سے وہاں سے سکھوں کے خلاف جہاد کیا جائے۔

جہاد کو اخلاقی جواز فراہم کرنے کے لئے اور مسلمانوں کو اس میں شمولیت پر تیار کرنے کے لئے یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ سکھوں نے مسلمانوں پر ظلم توڑ رکھے ہیں اور ان کے علاقوں میں انہیں کوئی مذہبی آزادی نہیں. مثلاً انہوں نے مسجدوں میں اذان بند کر دی قرآن شریف کی بے حرمتی کرتے ہیں اور مسجدوں میں گھوڑے باندھتے ہیں اس قسم کا پروپیگنڈہ مذہبی جذبات کو اشتعال دلانے کے لئے بہت تھا اور آپ کی تحریک میں کثرت سے لوگ شامل ہونا شروع ہو گئے. کیونکہ اس تحریک سے برطانوی حکومت کو کوئی خطرہ نہیں تھا اس لئے اس نے بھی ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی. بلکہ انہیں سہولتیں فراہم کیں۔

سید احمد شہید سے جب کسی نے سوال کیا کہ آپ سکھوں سے جہاد کے لئے کیوں جاتے ہیں اور انگریزوں کے خلاف جنگ کیوں شروع نہیں کرتے تو آپ نے اس کا جواب دیا:

"کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے نہ انگریزوں کا اور نہ سکھوں کا ملک لینا ہمارا مقصود ہے بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادران اسلام پر ظلم کرتے ہیں۔ سرکار انگریزی گو منکر اسلام ہے مگر مسلمانوں پر ظلم و تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو مذہبی فرائض و عبادت لازمی سے روکتی ہے۔ پھر ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں"۔ (۶)

انگریزی حکومت نے ان مجاہدین کو پوری پوری سہولتیں دیں تاکہ وہ سرحد جاکر سکھوں سے لڑ سکیں۔ اس سلسلہ میں انگریزوں کے مقاصد واضح تھے. ایک تو وہ اس بے چینی کو ختم کرنا چاہتے تھے جو ان کے اقتدار کی وجہ سے مسلمان معاشرہ میں پیدا ہوئی تھی دوسرے سکھوں کو اس میں الجھا کر انہیں کمزور کرنا چاہتے تھے۔

خاص بات یہ تھی کہ یہ تحریک شمالی ہندوستان اور بنگال میں زیادہ مقبول ہوئی۔ کیونکہ یہی وہ علاقے تھے جو انگریزی اقتدار کے نتیجہ میں معاشی و سیاسی طور پر زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ دوسرے علاقوں کے مسلمانوں نے اس تحریک میں زیادہ دلچسپی نہ لی۔ پنجاب میں سکھوں کی حکومت میں مسلمان اعلیٰ عہدوں پر تھے اور فوج میں بھی ان کی کافی تعداد موجود تھی اس لئے وہاں کوئی تحریک ان کے خلاف نہیں اٹھی اور نہ سید احمد شہید کو ان کی جانب سے کوئی مدد ملی۔ سندھ کے تالپور میروں نے انہیں اس لئے مدد نہیں دی کہ ان کے بارے میں انہیں جو اطلاعات ملی تھیں. ان کے مطابق وہ انگریزوں کے ایجنٹ تھے (۷) سرحد کے پٹھان سردار بھی چونکہ برطانوی اقتدار سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے تھے اس لئے وہ بھی اس تحریک کو سمجھنے سے قاصر تھے اس لئے یہ تحریک شمالی ہندوستان اور بنگال میں محدود ہو کر رہ گئی۔ اور یہی وجہ اس کی ناکامی کی ہوئی کیونکہ سرحد کے پٹھانوں نے ان کے ساتھ تعاون نہیں کیا اور یہ تعاون نہ کرنے کی وجہ ان کے اپنے سیاسی و معاشی حالات تھے۔ ۱۸۴۵ء میں جب برطانیہ نے پنجاب پر قبضہ کر لیا تو ان کا رویہ بھی اس تحریک کی جانب سے بدل گیا. انہوں نے مجاہدین کی مالی امداد کو جانے سے روک دیا اور ان پر مقدمے چلا کر ۱۸۶۴ء سے

۱۸۷۰ء تک انہیں مختلف سزائیں دے کر اس تحریک کو ختم کر دیا۔

جہاد تحریک ہندوستانی معاشرہ کے غیر ملکی مسلمانوں کے مخصوص ذہن کی پیداوار تھی جو ہندوستان کی اقوام سے مفاہمت اور اشتراک کرنے پر قطعی تیار نہ تھے اور ان کے مقابلہ میں غیر ملکیوں سے معاہدہ کرنے اور ان کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے راضی تھے، اس لئے سکھوں سے جنگ میں سارا فائدہ انگریزوں کو ہوا. جیسے ابدالی کی آمد نے انگریزوں کی طاقت کو مضبوط کیا۔

سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کے مذہبی خیالات نے بھی مسلمانوں کی اکثریت کو ان سے دور رکھا اور وہ اپنے متشددانہ مذہبی خیالات کی وجہ سے اپنے پروگرام کو زیادہ وسیع نہیں کر سکے اور اس سے پہلے کہ وہ ذہنی انقلاب لاتے اور مسلمان معاشرہ کو اپنے حق میں ہموار کرتے انہوں نے حالات کو سمجھے بغیر ایک ایسی سرزمین کو اپنا مرکز بنایا نہ تو وہ اس کی جغرافیائی صورت حال سے واقف تھے نہ وہاں کے لوگوں کی عادات رسوم و رواج اور زبان سے اور یہاں بھی انہوں نے شدت اور قوت سے اپنے خیالات کو ان پر مسلط کرنا چاہا اس لئے بہت جلد وہ سمٹ کر محدود ہو گئے ان حالات نے جہاد تحریک کو بہت جلد ختم کر دیا۔

— ۴ —

سید احمد شہید کی جہاد تحریک اور حاجی شریعت اللہ ودود میاں کی فرائضی تحریک کا برطانوی انتظامیہ پر یہ اثر ہوا کہ مسلمان انتہا پسند ہیں اور ان میں دوسروں کے لئے کوئی رواداری نہیں اس لئے انہیں سختی کے ساتھ کچلا جائے اور دوسرے سے علیحدہ رکھا جائے۔ (۸) اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے لئے ایک طبقہ نے یہ محسوس کیا کہ انگریزی اقتدار سے جنگ کر کے یا ان سے بغاوت کر کے باقی نہیں رہا جا سکتا ہے اس لئے ان کے ساتھ مفاہمت کی پالیسی کو اختیار کرنا چاہئے۔ اس کے نظریہ کے حامی بڑے بڑے زمیندار بھی تھے کیونکہ جہاد تحریک اور فرائضی تحریک میں ان پر بھی حملے کئے گئے تھے اور ان کی حیثیت و پوزیشن

عالم اسلام سے دور رکھنے کی کوشش کی تا کہ وہ برطانوی حکومت کی نظروں میں مشتبہ نہ ہوں۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ صرف سرسید نے مسلمانوں میں جدید تعلیم شروع نہیں کی تھی، یہ جدید تعلیم ان سے پہلے شروع ہو چکی تھی جب شمالی ہندوستان میں انگریزی اسکول کھلے تو مسلمان طلبہ نے ان میں کثیر تعداد میں داخلہ لیا، ان کی تعداد اس وقت ہندوؤں سے زیادہ تھی۔ مگر یہ داخلہ لینے والے متوسط طبقہ کے طالب علم تھے مسلمان امراء نے اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں اس لئے نہیں بھیجا کہ انہیں وہاں عام بچوں کے ساتھ بیٹھنا پڑتا (۱۰) اس لئے سرسید نے دراصل ان امراء کے بچوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں اور علی گڑھ میں انہوں نے اپنے سماجی درجہ اور مرتبہ کو قائم رکھا۔ چونکہ سرسید کو برطانوی حکومت کی تائید حاصل تھی۔ اس لئے امراء اور نوابوں نے یہاں اپنے بچوں کو بھیجنے میں تامل نہیں کیا، اور علی گڑھ برطانوی وفاداری کا ایک مرکز بن گیا۔

—۵—

جب تک ہندوستان میں سیاسی استحکام رہا یہاں کے مسلمانوں نے اسلامی ممالک کی بے چینی، انتشار اور خانہ جنگیوں سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ منگولوں نے جب وسط ایشیا اور ایران کو تاراج کیا اور جلال الدین خوارزم شاہ ان سے شکست کھاکر ہندوستان میں آیا تو التمش نے اسے پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ جب مغلوں کے زمانہ میں عثمانیوں، صفویوں اور ازبکوں کے درمیان جنگیں ہوئیں تو اس وقت بھی ہندوستان کی حکومت ان سے دور رہی، یہ ضرور ہوا کہ ان ہنگاموں کے نتیجہ میں جو لوگ ہجرت کر کے آئے انہیں پناہ دے دی گئی۔

عہد مغلیہ میں جب حجاز اور دوسرے عربی ممالک سے سفیر آتے تھے تو ان کا واحد مقصد مغل بادشاہ سے عطیات و مالی امداد وصول کرنا ہوتا تھا، اس لئے ان سفیروں کی دربار

میں کوئی عزت نہیں کی جاتی تھی۔

لیکن آخری عہد میں جب مسلمانوں کا سیاسی اقتدار کمزور ہوا اور انہوں نے خود کو ہندوستان کی ابھرتی ہوئی اقوام کے مقابلہ میں بے بس پایا تو اس وقت انہوں نے اپنے تحفظ کے لئے باہر دیکھنا شروع کر دیا اور اپنی مدد کے لئے افغانستان، ایران اور ترکی کے خلیفہ سے مدد کی درخواستیں کرنا شروع کر دیں۔ لہٰذا اس سیاسی انتشار کے زمانہ میں ان کا جذباتی تعلق امت مسلمہ اور مسلمان ممالک سے بڑھتا چلا گیا؛ عثمانی خلیفہ ان کا سربراہ بن گیا اور حرمین شریف سے ان کا روحانی تعلق اور بڑھ گیا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد مسلمان معاشرہ اندرونی و بیرونی طور پر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، اقتدار سے مکمل محرومی کے بعد ان کی معاشی و ثقافتی زندگی بھی ٹوٹ پھوٹ گئی۔ ہندوستان کی دوسری اقوام سے ان کے رشتے ختم ہو گئے اور انگریزوں نے انہیں یکہ و تنہا کر دیا۔ ان حالات میں انہوں نے ایک طرف تو اسلام کے شاندار ماضی میں پناہ لی اور دوسرے خود کو امت مسلمہ کا ایک حصہ سمجھ کر اپنے میں اعتماد پیدا کرنا چاہا۔

شبلی نے مسلمان معاشرہ کی پہلی ضرورت کو پورا کیا، کیونکہ ان کے نزدیک اسلامی تاریخ کی شان و شوکت کو اجاگر کرنے کی شدت کے ساتھ ضرورت تھی، "ہندوستان کی بہت سی تاریخیں لکھی گئیں اور مغلیہ اور تیموریہ کے کارنامے بڑی آب و تاب سے دکھائے گئے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی مجموعی تاریخ بھی ہماری قومی تاریخ کا ایک بہت چھوٹا حصہ ہے" (۱۱) عبدالحلیم شرر، راشد الخیری اور حکیم محمد علی نے تاریخی ناولوں کے ذریعہ اسلامی تاریخ کو ابھارا تو عبدالرزاق کانپوری نے شبلی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے البرامکہ اور نظام الملک پر کتابیں لکھیں۔ یہی وہ روایات تھیں جو حالی اور اقبال تک آئیں۔ حالی نے مسدس حالی لکھ کر اسلامی تاریخ کے عروج و زوال کو بیان کیا، تو اقبال کو مسجد قرطبہ میں جو شان و شوکت نظر آئی، وہ ہندوستان کی مسجد میں نظر نہیں آئی، شاہی مسجد میں بھی کہ جس کے زیر سایہ وہ محو خواب ہیں۔

ہندوستان کے مسلمان معاشرہ میں عالم اسلام سے محبت اور والہانہ لگاؤ اس دور میں

اس شدت کے ساتھ ابھرا کہ اس کی زد میں تاریخ، ادب، سیاست اور ثقافت ہر چیز آ گئی یہ ایک ایسا زبردست ریلہ تھا جس کی رو میں سب بہہ گئے چونکہ سرسید نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان اسلامی ملکوں اور خاص طور سے ترکی سے اپنا تعلق رکھیں، کیونکہ ترکی عالمی سیاست میں برطانیہ کے خلاف تھا اس لئے مولانا ابو الکلام آزاد نے اس پالیسی کی مخالفت کرتے ہوئے حسن نظامی کو ایک خط میں لکھا کہ:

> "علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کو عضو شل بنا دیا...... آج کوئی وطنی یا مقامی تحریک مسلمانوں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی جب تک کہ تمام دنیائے اسلام میں ایک بین الاقوامی اور عالمگیر تحریک نہیں ہوگی۔ زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چالیس کروڑ مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں"۔ (۱۲)

آزاد کا عالم اسلام سے تعلق اس زبان سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے لکھنی شروع کی اور جس میں عربی و فارسی کے الفاظ کی بھرمار تھی۔ ان کی تقلید میں دوسرے لوگوں نے بھی اسے اختیار کیا اور عربی نما اردو لکھی جانے لگی اور اس نے اردو سمجھنے والوں کا حلقہ اور محدود کر دیا اور اس زبان کی ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ساتھ مل کر جو نشوونما ہو رہی تھی، اس میں زبردست رکاوٹ پیدا ہوئی۔

—٦—

ہندوستانی مسلمانوں کی عالم اسلام سے وابستگی نے دو منفرد رجحانات پیدا کئے. ایک تو انہوں نے ایک بار پھر ہندوستان کی قوموں سے اپنے رابطے ختم کر لئے اور ان کے ساتھ تعاون اور مفاہمت کی پالیسی کو اختیار نہیں کیا، دوسرا یہ کہ انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں انہوں نے اسلامی ممالک پر بھروسہ کرنا شروع کر دیا اور خود عالم اسلام کا ایک حصہ سمجھ کر انہوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ چونکہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اس لئے ان کی پکار پر دوسرے اسلامی ممالک فوراً آ جائیں گے۔

یہ سوچ ان کی تاریخی ناپختگی کا ثبوت تھی۔ انہوں نے ان اسلامی ممالک کے

حالات سے واقفیت کی کوشش نہیں کی جن کی مدد کے لئے یہ طلبگار تھے۔ عرب ممالک عثمانی سلطنت کا حصہ بن جانے کے بعد اپنی آزادی اور خود مختاری کھو چکے تھے اور ترکی کی ناانصافیوں اور ظلم و ستم کے خلاف وہاں زبردست جذبات تھے جن سے فائدہ اٹھا کر یورپی اقوام انہیں بغاوت پر اکسا رہی تھیں۔ ایران میں قاچار خاندان کی حکومت کے نتیجہ بدعنوانیاں اور رشوت زوروں پر تھی اور یورپی سامراجی طاقتیں اس پر نظریں جمائے ہوئے تھیں افغانستان دنیا سے کٹا ہوا انتہائی پس ماندہ ملک تھا۔ ترکی سلطنت اپنی وسعت کے بوجھ کے نیچے دبی سسک رہی تھی اور اس میں خود کو محفوظ کرنے کی ہمت نہ تھی اس لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ دوسروں کی مدد کرتی۔

اسلامی ممالک کے ان سیاسی حالات سے ہندوستان کا مسلمان معاشرہ ناواقف تھا اس لئے جب انہوں نے ریشمی رومال کی تحریک کی ابتدا کی تو اس کی تمام بنیاد مفروضوں پر تھی کہ سلطان ترکی کی مدد سے اور افغانستان کے تعاون سے ہندوستان میں انگریزوں سے جنگ کی جائے گی۔ انہوں نے اس کا بھی تجزیہ نہیں کیا کہ انگریز سامراج کی جڑیں کس قدر گہری ہیں اور سیاسی چالوں، جنگی حربوں اور جنگی آلات میں وہ کس قدر آگے ہیں۔ اور نہ اس کا تجربہ کیا گیا کہ ہندوستان کی غیر مسلمان اقوام کا ردعمل کیا ہو گا؟ اور کیا یہ ان کے مفاد میں ہو گا کہ ایک مرتبہ پھر یہاں اسلامی حکومت قائم ہو؟ اور کیا خود ہندوستان کے مسلمان ذہنی طور پر مزاحمت کے لئے تیار ہیں؟

جب اس تحریک کا ہراول دستہ افغانستان گیا تو اس وقت انہیں افغانستان کی صحیح صورت حال کا علم ہوا کہ افغانستان کی ۸۰ لاکھ کی آبادی میں سے صرف ایک فیصد لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ڈاک کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ محکمہ تار و ٹیلی گراف بالکل نہیں تھا۔ ٹیلی فون کی سہولت صرف ایک لائن تھی جو امیر افغانستان کے لئے تھی۔ فوج کی یہ حالت تھی کہ نہ تو ان کے پاس توپیں تھیں اور نہ جدید ہتھیار، فوجیوں کو وقت پر تنخواہ نہیں ملتی تھی اس لئے فوج میں نہ ڈسپلن تھا اور نہ تربیت، امیر حبیب اللہ مطلق العنان بادشاہ تھے۔ کابینہ یا پارلیمینٹ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ (۱۳)

ان حالات کو دیکھ کر جو لوگ مدد کے لئے گئے تھے انہیں زبردست دھچکہ لگا۔ ظفر حسن لکھتے ہیں کہ:

"ہم نے امیدیں باندھ رکھی تھیں کہ افغانستان، ہندوستان کی آزادی میں مدد دے گا اور انگریزوں سے لڑے گا۔ یہاں آکر دیکھا کہ کسی کو جنگ کے بارے میں کچھ خبر ہی نہیں۔ لوگ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں۔ ہم نے خط لکھنے کے لئے کاغذ اور لفافے تلاش کئے تو معلوم ہوا کہ کوئی ایسی دکان ہی نہیں جہاں قلم، دوات یا پنسل بکتی ہو۔ ہمیں کہا گیا کہ کاغذ قصاب کی دکان پر بکتے ہیں۔ مگر قلم دوات بیچنے والا کوئی نہیں" (۱۴)

آگے چل کر وہ افغانستان کے بارے میں مزید تفصیلات بتاتے ہیں:

"اس زمانہ میں افغانستان میں نہ باقاعدہ عدالتیں تھیں نہ باقاعدہ جج تھے کہ ملزموں کے مقدمے کی سماعت کریں نہ ہی وکیل اور نہ بیرسٹر تھے کہ ملزموں کا مدافعہ کریں۔ وہاں اس وقت ایسا اندھیر کھاتہ مچا ہوا تھا کہ قیدیوں کی پیشی کی نوبت بڑی مشکل اور دیر سے آتی اور عام طور سے اس کے لئے بڑی بڑی رقمیں بطور رشوت دینی پڑتی تھیں۔" (۱۵)

اس تحریک کے ایک رکن اور راہنما مولانا محمود الحسن کو حجاز میں شریف مکہ نے سازش کے ذریعہ انگریزوں کے حوالے کر دیا اس لئے جب وہ مالٹا میں اسیری کی مدت گزار کر ہندوستان میں آئے تو یہاں ان کا استقبال کرنے والوں میں کچھ لوگوں نے عربی عمامہ باندھ رکھے تھے اس پر انہوں نے اس لباس سے نفرت کا اظہار کیا۔

لیکن ریشمی رومال تحریک کی ناکامی کا تجزیہ نہیں کیا گیا اور اس لئے اس تجربہ سے ہندوستان کے مسلمانوں نے کچھ نہیں سیکھا۔ پہلی جنگ عظیم میں جب ترکی کو شکست ہوئی تو ہندوستان کے مسلمانوں کی ہمدردیاں ترکی کے خلیفہ سے بڑھ گئیں اور انہوں نے حکومت برطانیہ کو دھمکی دی کہ اگر خلیفہ کے ساتھ برابر تاؤ کیا گیا تو وہ ہجرت کر کے افغانستان چلے جائیں گے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۲۰ء میں ہندوستان میں ایک بار پھر مسئلہ اٹھا کہ کیا ہندوستان دارالامان ہے یا دارالحرب؟ اس بار مولانا عبدالباری فرنگی محل نے یہ فتویٰ دے دیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے اس لئے مسلمان ہجرت کر جائیں۔ اس پر مولانا آزاد نے ایک اعلان جاری کیا کہ:

"تمام دلائل شرعیہ، حالات حاضرہ، مصالح فہمہ امت مقتضایات صالحہ و موثرہ پر نظر ڈالنے کے بعد پوری بصیرت کے ساتھ اس اعتقاد پر مطمئن ہو گیا ہوں کہ مسلمانان ہند کے لئے بجز ہجرت کے کوئی اور چارہ شرعی نہیں۔ ان تمام مسلمانوں کے لئے جو اس وقت ہندوستان میں سب سے بڑا عمل انجام دینا چاہیں ضروری ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں" (۱۶)

علماء کے ان فتووں اور اعلانات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اپنا گھر بار ختم کر کے اپنی جائدادیں اور مکانات بیچ کر ہجرت پر آمادہ ہو گئی۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو ہندوستان میں معاشی طور پر پریشان تھے اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ افغانستان میں شائد ان کی زندگی بدل جائے وہ اس تحریک میں شامل ہو گئے۔

"جتنے ان پڑھ کاشتکار تھے جن کے لئے ہندوستان میں ساہو کاروں زمینداروں اور گورنمنٹ کے مطالبات کی وجہ سے زندگی تنگ ہو چکی تھی اس تحریک میں شریک ہوئے۔ اکثر تو پیدل آئے" (۱۷)

افغانستان میں ان پر جو بیتی اس کا ذکر کرتے ہوئے ظفر حسین لکھتے ہیں:

"قافلے پے در پے جلال آباد اور وہاں سے کابل پہنچنے لگے. شروع میں ان کو خیموں میں چمن حضوری میں جگہ دی گئی...... بے چاری پردہ پوش خواتین وہاں سخت مشکلات میں مبتلا ہوئیں۔ بعض بد اخلاق کابلیوں نے ان پر سخن اندازی بھی کی۔ بعض لوگوں نے تو روٹی اور کھانا خریدنے کے لئے اپنا اثاثہ البیت بھی فروخت کرنا شروع کر دیا جس کو کابلیوں نے آدھے دام میں بھی نہ لیا" (۱۸)

ریشمی رومال تحریک اور ہجرت تحریک دونوں ہندوستان کے مسلمان راہنماؤں کے تاریخی شعور کی کمی اور جدید دور کی سیاسی تبدیلیوں سے ناواقفیت کی وجہ سے ناکام ہوئیں، جنہوں نے چند مفروضوں پر یقین کر کے یہ دونوں تحریکیں چلائیں ہجرت تحریک میں چند علماء نے فتوے دیئے تھے جن میں مولانا عبدالباری فرنگی محل اور مولانا آزاد شامل تھے انہوں نے خود ہجرت نہیں کی اور ہزارہا مسلمان خاندانوں کو تباہ و برباد کرا دیا۔ مگر اس المیہ سے بھی ہندوستان کے مسلمان معاشرہ نے کچھ نہیں سیکھا۔

— ۷ —

برطانوی عہد میں ایک بار پھر عہد وسطی کی طرح ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی سیاسی و روحانی وفاداری کا مرکز ہندوستان سے باہر کر لیا. عثمانی خلیفہ کو امت مسلمہ کا سربراہ تسلیم کرتے ہوئے اپنی وفاداریاں اس ادارے سے وابستہ کر دیں. اور اس ادارے کے دفاع کے لئے اپنے تمام مسائل کو پس پشت ڈال دیا۔ ابو الکلام آزاد نے اس سلسلہ میں اعلان کیا کہ:

> "اسلام کا مسلمہ حکم ہے کہ خلیفہ اسلام کی اطاعت و حمایت اور غیر مسلم حملہ آوروں کے مقابلہ میں دفاع مسلمانوں پر فرض ہے۔ جو اس سے انکار کرے وہ ایسی شدید مصیبت میں مبتلا ہو گا جس کے بعد کفر صریح کے سوا ضلالت کا کوئی درجہ نہیں"۔ (۱۹)

خلافت کے ادارے کے تحفظ کے لئے جو تحریک ہندوستان میں چلی یہ مسلمانان ہند کے تاریخی شعور کے فقدان کو ظاہر کرتی ہے کہ ترکی خلافت کو وہ اسلامی شان و شوکت سمجھتے تھے، مولانا محمود الحسن نے نومبر ۱۹۲۰ء کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"دنیائے اسلام میں گزشتہ چند صدیوں سے سلطان ترکی ..... کی واحد سلطنت اسلامی شان و شوکت کی ضامن تھی" وہ آگے چل کر کہتے ہیں کہ:

"..... جمہور اہل اسلام کے اتفاق سے سلطان ترکی خلیفۃ المسلمین مانے جاتے تھے اور

خلافت کے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیتے تھے" (۲۰) یہ بیانات ترکی کی تاریخ سے قطعی ناواقفیت کو ظاہر کرتے ہیں خلافت کا عہدہ ترکی کے زوال کے ساتھ ہی فرسودہ اور بے کار ہو چکا تھا اور خود ترکی میں اس کے خلاف تحریکیں چل رہی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم میں خلیفۃ المسلمین نے اپنے مفادات کی خاطر اتحادیوں سے ملک و قوم کا سودا کر لیا تھا، اور اسی کا ردعمل تھا کہ مصطفیٰ کمال نے ترکی قومیت کے زیر اثر تحریک چلائی اور ۱۹۲۴ء میں خلافت ختم کر کے ترکی کو اس عذاب سے نجات دلائی۔

ہندوستان کے مسلمان ترکی کے حالات سے ناواقف تھے اور اس لئے وہ خلافت کے فرسودہ ادارے کی بحالی کے لئے تحریک چلا رہے تھے۔ اس کا منفی اثر یہ ہوا کہ اس تحریک نے مسلمانوں کی مقامی مسائل سے توجہ ہٹا کر انہیں بیرونی و غیر ملکی مسائل میں الجھا دیا۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ خلافت تحریک سامراج کے خلاف ایک علامت بن کر ابھری، لیکن اس کا تجزیہ نہیں کیا جاتا کہ اگر کسی غلط علامت کو جدوجہد کے لئے چنا جائے گا تو اس کا خمیازہ بھی معاشرہ کو بھگتنا پڑے گا اور مسلمانان ہند نے یہ نقصان برداشت کیا کہ خلافت کو اتحاد کی علامت بنا کر اپنے مسائل کے بجائے غیر ملکی مفادات کے لئے اپنی توانائی ضائع کی۔

ـ ۸ ـ

ترکی میں خلافت کے خاتمہ کے بعد بھی ہندوستان کے مسلمان لیڈر اپنے سیاسی اقتدار کی جنگ و جدوجہد سے نہیں تھکے، ابھی ان کے ترکش میں اور تیر تھے، انہوں نے اب ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ وہ بغیر کسی سرپرست کے رہ گئے ہیں اور ان کے مسائل اسی وقت حل ہوں گے جب ان کا کوئی خلیفہ یا امام ہو گا۔ اس مقصد کے لئے مولانا آزاد نے ہندوستان میں ایک مہم چلائی کہ مسلمان اپنی جماعت کے لئے ایک امام مقرر کریں۔ سید سلمان ندوی نے اس سلسلہ میں تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کے مذہبی امور کا سربراہ شیخ الاسلام ہو:

"جس کی عزت و وقار کا سرکاری طور پر اعتراف کیا جائے۔ اس کے بعد

ایک بڑی تنخواہ دے کر اس کے اعزاز کو بڑھایا جائے اس کا تقرر مسلمان جماعتوں کے انتخاب اور گورنمنٹ کی منظوری سے ہو"۔ (۲۱)

لیکن نہ تو حکومت نے شیخ الاسلام کا عہدہ مقرر کیا اور نہ علماء میں سے کسی ایک کو مسلمانوں کی جماعت کا امام مقرر کیا گیا کیونکہ مسئلہ یہ تھا کہ علماء کے اختلافات کو دیکھتے ہوئے کسی ایک پر سب کا متفق ہونا ناممکن تھا۔ اس لئے آزاد کے مدوحین نے انہیں "امام الہند" کہنا شروع کر دیا، تو عطاء اللہ شاہ بخاری کے حامیوں نے انہیں "امیر شریعت" کا خطاب دے دیا اور ہندوستان کے مسلمان ایک بار پھر کئی اماموں اور امیروں میں تقسیم ہو گئے۔

جدید سیاست میں مذہب کو سیاست میں لا کر جو تحریکیں چلائی گئیں اس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان اپنے مسائل کو صحیح پس منظر میں نہیں دیکھ سکے۔ دارالامان اور دارالحرب کے فتووں نے انہیں اس پس منظر میں رکھا کہ ہندوستان میں رہا جائے یا یہاں سے ہجرت کی جائے۔ سامراج کے خلاف تحریکوں میں حصہ لینے کے بجائے انہوں نے مذہبی تحریکوں میں حصہ لیا جیسے خدام کعبہ، ہجرت، تنظیم و تبلیغ، خلافت، پان اسلام ازم، ابن مسعود کی حمایت و مخالفت اور سیرت کمیٹی۔ جب ایک تحریک اپنا اثر کھو بیٹھتی تو اس کی جگہ فوراً دوسری شروع ہو جاتی۔ ان تحریکوں نے مسلمانوں کو ہندوستان کی سیاست کا صحیح شعور پیدا نہیں ہونے دیا شبلی کی تحریریں، محمد علی جوہر کی تحریر و تقریر، مولانا آزاد کے الہلال اور البلاغ اور اقبال کی شاعری نے مسلمانوں کو مقامی مسائل سے ہٹا کر بیرونی و غیر ملکی مسائل میں الجھا دیا جس کی وجہ سے وہ ہندوستان کی دوسری اقوام کے مقابلہ میں سیاست میں پس ماندہ رہ گئے۔

یہ اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر سامراج کے خلاف جنگ لڑنے اور یہاں جمہوری حکومت کے قیام کی جدوجہد میں بھرپور حصہ نہیں لیا۔ کیوں کہ انہیں بار بار اس چیز کا احساس دلایا گیا تھا کہ جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جس میں اکثریت حکومت کرتی ہے اور اقلیت غلام بن کر رہتی ہے علی گڑھ کالج کے پرنسپل

تھیوڈر ماریسن نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا.

"جمہوری حکومت اقلیتوں کو لکڑی کاٹنے والوں اور پانی بھرنے والوں کے درجہ پر پہنچا دے گی اور مسلمانوں کا ملک میں نام و نشان باقی نہیں رہے گا"
(۲۲)

جمہوریت کے ان مخالفانہ جذبات کی وجہ سے ان میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہوا کہ وہ دوسروں کے ساتھ رواداری کے ساتھ مل کر رہیں اور اپنے حقوق کا تحفظ کریں۔

حوالہ جات

۱۔ عابد حسین: The Destiny of Indian Muslims, Lahore, 1983, p. 18

۲۔ پی ہارڈی: The Muslims of British India Cambridge, 1972 p. 59

۳۔ حسین احمد مدنی: نقش حیات، کراچی ۱۹۷۹ء ص ۳۱۰ (نوٹ)

۴۔ نقش حیات: ۳۱۱ (نوٹ)

۵۔ ہارڈی۔ ص ۱۰۹ ۔ ۱۱۰

۶۔ جعفر تھانیسری: سوانح احمدی، کراچی ۱۹۶۹ء ص ۷۰

۷۔ ڈاکٹر مبارک علی: Sayyid Ahmad Shaheed in Sind. In Grassroots. vi - vii. 1982, pp. 32--37

۸۔ ہارڈی: ۶۰

۹۔ ایضاً ۱۱۱

۱۰۔ رام گوپال: Indian Muslims, 1959, p. 32

۱۱۔ موج کوثر: ۲۸۷

۱۲۔ ایضاً: ۲۵۵

۱۳۔ ظفر حسن: آپ بیتی، لاہور (؟) ص ۵۴ ۔ ۶۲

۱۴۔ ایضاً: ۸۶

۱۵۔ ایضاً ۱۲۴

۱۶۔ ابو سلمان شاہجہاں پوری۔ تحریک نظم جماعت، لاہور ۱۹۷۷ء ص ۲۹۸

۱۷۔ ظفر حسن: ۲۱۳

۱۸۔ ایضاً: ۲۱۳

۱۹۔ تحریک نظم جماعت: ۲۹۴

۲۰۔ پروین روزینہ (مرتب) جمعیت علماء ہند، اول اسلام آباد ۱۹۸۰ء ص۔ ۶۱

۲۱۔ تحریک نظم جماعت۔ ۴۲

۲۲۔ طفیل منگلوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل، کراچی (؟) ص ۳۴۹

اختتامیہ

برصغیر میں مسلمانوں کے معاشرہ کا المیہ یہ رہا کہ یہاں جو غیر ملکی مسلمان آئے اور سیاسی طور پر اقتدار پر قابض ہوئے انہوں نے اس کے ساتھ ہی کلچرل امپریلزم کے ذریعہ ہندوستانی معاشرہ کو ذہنی طور پر تسخیر کر کے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو اس بری طرح ختم کیا کہ ان کی ذہنی اپج اور جدت ختم ہو کر رہ گئی۔

مذہبی طور پر ہندوستان کے مسلمانوں پر ہمیشہ یہ اعتراض کیا جاتا رہا کہ ان کے مذہب میں ہندو رسومات داخل ہو گئی ہیں جس کی وجہ سے وہ خالص اور پاکیزہ اسلام سے دور ہو گئے ہیں اور اسی وجہ سے ان پر قہر الٰہی نازل ہوا ہے اور یہی وجہ ان کے زوال کی ہے۔ ثقافتی اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں نے خود کو ہمیشہ وسط ایشیا و ایران سے کم تر سمجھا۔ اس کمپلیکس کی وجہ سے ہندوستانی مسلمان معاشرہ اپنی کوئی آزاد اور خود مختار ثقافت پیدا نہیں کر سکا اور اس کے کسی مذہبی عالم، شاعر و ادیب کو عرب و ایران میں بطور سند تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس کلچرل امپریلزم کی وجہ سے ہندوستان کی مقامی ثقافتیں بھی ترقی نہیں کر سکیں کیونکہ حکومتوں نے ان کی کوئی سرپرستی نہیں کی اس لئے ثقافتی اعتبار سے یہ طویل دور حکومت بنجر و خشک رہا۔

اس لئے آج جب ہم ماضی کے ورثہ کی بات کرتے ہیں تو تمام علم و ادب جو اس دور میں پیدا ہوا تھا موجودہ دور میں ہمارے معاشرے کی پہنچ سے دور ہے کیونکہ یہ سب فارسی زبان میں ہے اور فارسی سے ہماری واقفیت ختم ہو چکی ہے۔ اور یہ ایک منطقی وجہ ہے کیونکہ فارسی زبان ہندوستان کی زبان نہیں تھی اس لئے یہ یہاں ترقی نہ کر سکی اور کبھی بھی حکمران طبقوں اور شہروں سے بڑھ کر عوام یا دیہات تک نہیں پہنچی اور وقت کے ساتھ یہ اس ملک

سے ختم ہو گئی اور اس کا تمام علمی ورثہ ہماری نسل کے لئے بے کار ہو گیا۔

ہندوستان میں جو غیر ملکی حکمران ہجرت کر کے آئے اور یہاں رہائش اختیار کی ان میں آبائی و اجدادی وطن سے ایک زبردست رومانوی تعلق قائم رہا اور "وطن واپسی" ان کے ذہن و دماغ پر اس قدر سوار رہی کہ اس جذبہ کے تحت وہ ہندوستان کی ہر چیز سے بے گانہ رہے اور ان کے ذہن میں یہ خیال بیٹھا رہا کہ انہیں ایک دن ہجرت کر کے اپنے وطن جانا ہے۔ وہ ہندوستان کو کفر و شرک کی سرزمین سمجھتے رہے اور ہمیشہ اس بات کو ذہن میں رکھا کہ یہاں رہتے ہوئے وہ اپنے مذہب اور عقائد کو محفوظ نہیں رکھ سکیں گے، اس کا اظہار علماء کی طرف سے بار بار ہوتا بھی رہتا تھا، جو انہیں ہندوانہ رسومات پر برا بھلا کہتے رہتے تھے اس لئے ان کی خواہش تھی کہ یا تو ہندوستان سے شرک ختم کر دیا جائے یا ایسے ملک میں جایا جائے جہاں ان کے عقائد کی بالا دستی ہو اور انہیں چیلنج کرنے والا کوئی نہ ہو جب تک وہ سیاسی طور پر طاقتور رہے انہوں نے اپنے مذہبی عقائد کو محفوظ تصور کیا، مگر جیسے ہی ان کا اقتدار ختم ہوا انہیں یقین ہو گیا کہ ان کا مذہب ہندوستان میں محفوظ نہیں رہ سکتا ہے۔ اس ذہنی خلفشار کو بڑھانے میں علماء کا بڑا حصہ رہا اور مذہب کے زیر اثر وہ ہندوستان میں اپنی جڑیں نہیں پیوست کر سکے۔

برصغیر کا مسلمان معاشرہ اس ذہنیت کی وجہ سے تاریخ میں کئی نشیب و فراز سے گزرا، مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے تاریخ سے کوئی سبق اب تک نہیں سیکھا اور یہی اس معاشرہ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

O